

اسلام

انسانی حقوق کا پاسبان

سید جلال الدین عمری

اسلام

16

انسانی حقوق کا پاسبان

سید جلال الدین عمری



مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

نام کتاب	:	اسلام انسانی حقوق کا پاسبان
مصنف	:	سید جلال الدین عمری
صفحات	:	۱۷۲
اشاعت	:	جنوری ۲۰۰۸ء
تعداد	:	۲۰۰۰
قیمت	:	۵۵/- روپے
ناشر	:	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
		ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵
		فون: ۲۶۹۷۱۶۵۲، ۲۶۹۵۳۳۳۱ فیکس: ۲۶۹۳۷۸۵۸
		E-mail: mmipub@nda.vsnl.net.in
		Website: www.mmipublishers.net
مطبوعہ	:	ریجنٹ پرنٹنگ پریس، نئی دہلی - ۲

ISLAM INSANI HUQOOQ KA PASBAN (Urdu)

By: Sayyid Jalaluddin Umari

Pages: 172

Price: Rs.55.00

ترتیب

۷

پیش لفظ

۱۱

انسانی حقوق کا تصور (تاریخی پس منظر)

بنیادی تصورات

۲۱

بنیادی تصورات

۲۲

اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے

۲۳

انسان کا وجود اللہ کی مشیت کے تابع ہے

۲۵

کائنات سے استفادہ کا ہر شخص کو حق ہے

۲۶

انسان صرف ایک خدا کا بندہ ہے

۲۸

مذہبی غلامی کا جواز نہیں ہے

۲۹

انسان محترم ہے

۳۱

اللہ تعالیٰ فرماں روا ہے حقیقی

۳۲

اجتہاد کا حق حاصل ہے

۳۵

اخلاق اور قانون کا تعلق

۳۶

خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس

فرد کے شخصی اور ذاتی حقوق

۴۰

زندہ رہنے کا حق

۴۲

حق مساوات

۴۷

عدل و انصاف کا قیام

۵۱

قانون کی برتری

۵۳

ریاست حقوق کی نگراں ہے

۵۳

جرم عدالت سے ثابت ہوگا

۵۴

۵۵

۵۶

۵۸

۵۹

کسی کو غلام نہیں بنایا جاسکتا
کسی کو ناحق سزا نہیں دی جاسکتی
عزت و آبرو کا حق
سفر کا حق
مظلوم کا حق

بنیادی ضروریات کی تکمیل کا حق

۶۲

۶۲

۶۴

۶۵

۶۷

۶۷

۶۹

۷۱

انسان کی بنیادی ضروریات
معاشی جدوجہد
لباس
مکان
خادم اور سواری
معاشی خوش حالی
حکومت کی ذمہ داری
دنیا مقصود نہ بن جائے

سماجی و معاشرتی حقوق

۷۴

۷۶

۷۸

۸۰

۸۲

۸۴

۸۶

۸۸

فکر کی آزادی
عمل کی آزادی
اظہار خیال کی آزادی
خاندان بسانے کا حق
نجی زندگی میں عدم مداخلت
کسی کے گھر بلا اجازت داخلہ کی ممانعت
ملک و ملت کی خدمت کا حق
تنقید اور اصلاح کا حق

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

۹۲

عورت کے حقوق

۹۳

بیوی کے حقوق

۹۵

بیوہ کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے حقوق

۹۶

یتیموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

۱۰۲

غلاموں اور محکوموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

۱۰۶

محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

۱۰۸

ضعیفوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق

۱۱۳

صبر کی تلقین

۱۱۳

ذمہ داریوں میں تخفیف

۱۱۶

صلاحیتوں کا اعتراف

۱۱۹

معذور دہرے اجر کا مستحق ہے

۱۲۰

معاشرے کی ذمہ داری

۱۲۲

عزت کا مقام دیا جائے

۱۲۲

حسن سلوک کیا جائے

۱۲۴

دل جوئی کی جائے

۱۲۶

بدسلوکی نہ کی جائے

۱۲۷

پاگل غیر مکلف ہے

۱۲۸

پاگل سے متعلق بعض احکام

۱۲۹

کم زور عقل والوں کی رعایت

۱۳۰

معذور کی کفالت

دفاع کا حق

۱۳۳

دفاع میں جان دینا شہادت ہے

۱۳۵

دفاع ایک قانونی حق ہے

۱۳۶

اپنی ذات کا دفاع

۱۳۶

کیا اپنی ذات کا دفاع واجب ہے؟

۱۳۷	مال کا دفاع
۱۳۹	کیا مال کا دفاع واجب ہے؟
۱۴۰	خاندان اور بیوی بچوں کا دفاع
۱۴۱	عفت و عصمت کا دفاع
۱۴۲	کیا عفت و عصمت کا دفاع واجب ہے؟
۱۴۲	دفاع میں تعاون
۱۴۵	دفاع کرنے والے پر حملہ آور کے نقصان کی ذمہ داری نہیں ہے
۱۴۸	دفاعی اقدام میں الاہل فالاہل کا اصول
۱۵۰	کسی بھی اقدام کا فیصلہ حالات کے تحت ہوگا
۱۵۱	دفاعی اقدام کے لیے ثبوت چاہیے
۱۵۳	دفاعی اقدام حملہ کے وقت ہوگا
۱۵۳	خلاصہ بحث

مذہب کی آزادی کا حق

۱۵۶	عقیدہ اور مذہب کے لیے جبر کی اجازت نہیں ہے
۱۶۱	اللہ کے رسولوں کا احترام
۱۶۲	ذمیوں کے حقوق
۱۶۳	شخصی قوانین پر عمل کا حق
۱۶۳	مذہب پر گفتگو ہو سکتی ہے
۱۶۴	مذہب پر گفتگو کے حدود

کتابیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اس دنیا میں جو انسان پیدا ہوتا ہے کچھ حقوق لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن دنیا نے یہ حقوق کبھی اسے دیے اور کبھی وہ ان سے محروم رہا۔ کسی کو ان حقوق کا نہ ملنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ان ہی سے اس کی عظمت اور ترقی وابستہ ہے۔ یہ اسے رفعت اور بلندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ اس سے چھن جائیں تو وہ ذلت اور پستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور اس کی ترقی کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ حقوق کیا ہیں اور کیا سب انسانوں کے یکساں حقوق ہیں یا ان کے درمیان فرق ہے؟ یہ حقوق کیسے حاصل کیے جائیں اور ان کے تحفظ کی کیا صورت ہے؟ موجودہ دور میں یہ سوال، بعض تاریخی اسباب کی بنا پر، پوری فضا میں گشت کر رہا ہے اور ہر طرف اس کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ مختلف ملکوں میں ان حقوق کی صورت حال دیکھی جاتی ہے، اس کا جائزہ اور نقد و احتساب ہوتا ہے، سماج میں ان کا شعور پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے، قانون اور عدالت کے ذریعہ ان کی حفاظت کے اقدامات کیے جاتے ہیں، اس کے لیے سماجی، معاشی اور سیاسی قوت بھی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ ان کوششوں کی اہمیت اور قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بعض اوقات ان کے بہتر نتائج بھی دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ سوال بھی بار بار پوری شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ یہ کوششیں کس حد تک غیر جانب دار اور تعصب و تحزب سے پاک ہیں؟ عالمی سطح

پر حقوق کے نگراں ان کوششوں کو حقوق کی پامالی کا بہانہ تو نہیں بنا رہے ہیں؟
 حقوق انسانی کے سلسلہ میں اسلام کا تصور بہت ہی واضح اور اس کا کردار بالکل
 نمایاں ہے۔ اس نے فرد اور جماعت اور مختلف سطح کے افراد اور طبقات کے حقوق کا تعین
 کیا اور عملاً یہ حقوق فراہم کیے۔ جن افراد اور طبقات کے حقوق ضائع ہو رہے تھے ان کی
 نصرت و حمایت میں کھڑا ہوا اور جو لوگ ان حقوق پر دست درازی کر رہے تھے ان پر
 سخت تنقید کی اور انھیں دنیا اور آخرت کی وعید سنائی، معاشرہ کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کی
 تعلیم و ترغیب دی اور ہم دردی و غم گساری کی فضا پیدا کی۔

قرآن مجید انسانی حقوق کی ان کوششوں کی اساس ہے اور احادیث میں ان کی
 قوی و عملی تشریح موجود ہے۔ قرآن و حدیث کا اندازِ بحث و نظر مروجہ قانونی کتابوں کا سا
 نہیں ہے۔ قانون کی کتابیں حقوق کا دفعہ وار ذکر کرتی اور حسب ضرورت ان کی تشریح
 کرتی ہیں۔ قرآن مجید کا طرزِ گفتگو اخلاقی بھی ہوتا ہے اور قانونی بھی۔ وہ جب اخلاق کا
 ذکر کرتا ہے تو ادائے حقوق کو سیرت و اخلاق کے لازمی تقاضے اور اعلیٰ کردار کی حیثیت
 سے پیش کرتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی ستائش اور تعریف کرتا ہے جو ہر ایک کا حق ادا کرتے
 ہیں اور انھیں دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی کی بشارت دیتا ہے اور جہاں ظلم و ستم اور
 حقوق کی پامالی ہو وہ اس کے سنگین نتائج سے آگاہ کرتا اور اس پر جہنم کی وعید سناتا ہے۔
 اس کے ساتھ وہ ان حقوق کا قانونی الفاظ میں بھی ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ
 وہ کسی حق کا ایک ہی جگہ ذکر کرے، اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کا ایک پہلو ایک جگہ
 اور دوسرا پہلو دوسری جگہ بیان کرتا ہے۔

احادیث کا بھی یہی انداز ہے۔ اس لیے کسی حق کو جاننے کے لیے پورے
 قرآن اور ذخیرہ حدیث کو دیکھنا پڑتا ہے۔ ہمارے فقہاء کرام اور ماہرین شریعت نے
 تفصیل سے اس پر غور کیا ہے اور حقوق کے تعین کی، اپنے دور کے حالات و ظروف کے
 لحاظ سے کوشش کی ہے۔ اسلامی قانون کے سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

اس عاجز کو اس موضوع سے ایک عرصے سے دل چسپی رہی ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں پر اس کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ پیش نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں بہ راہ راست اس موضوع سے متعلق قرآن و حدیث کی تعلیمات تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر قدیم علماء و فقہاء کے بے نظیر کام سے بھی ممکنہ حد تک استفادہ کیا گیا ہے، جن حقوق پر راقم کی دوسری کتابوں اور مضامین میں تفصیل سے بحث موجود ہے، اس کتاب میں بہت ہی اختصار کے ساتھ، بلکہ چند جملوں میں ان کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس سب کے باوجود کچھ ایسے حقوق بھی ہیں جن کا ذکر آنے سے رہ گیا ہے، لیکن پوری کتاب کی روشنی میں ان کے سلسلے میں اسلام کے موقف کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

انسانی حقوق کے سلسلے کی جدید معلومات ڈاکٹر، ایس سبرامنیم Gr. S. Subramanian کی کتاب Human Rights-International Challenges سے لی گئی ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

کتاب کا انداز خالص قانونی نہیں ہے بلکہ جس حق کا ذکر کیا گیا ہے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی توضیح و تشریح اور حسب موقع معاشرہ پر اس کے اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ کہیں کہیں حقوق کی قانونی حیثیت واضح کرنے کے ساتھ اس سے متعلق اسلام کی اخلاقی تعلیمات بھی بیان ہوئی ہیں۔ اخلاق اور قانون کا رشتہ بہت قوی ہے۔ کسی فرد یا معاشرہ میں اخلاقی حس بیدار ہو جائے تو وہ قانون سے زیادہ کارگر ہوتی ہے اور آدمی بغیر کسی جبر کے، خوش دلی سے ہر ایک کا حق ادا کرنے لگتا ہے۔ بعض مباحث میں فقہاء کرام کی رائیں اور ان کے اختلافات کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے حقوق کے نئے گوشے واضح ہوتے ہیں اور شریعت میں جو وسعت اور گنجائش پائی جاتی ہے وہ سامنے آتی ہے۔ کوشش اس بات کی رہی ہے کہ موضوع سے متعلق اسلام کی مستند تعلیمات پیش کی جائیں تاکہ کسی بھی موقع پر اعتماد کے ساتھ اس کا حوالہ دیا جاسکے۔ اس

تاریخی پس منظر

اس دنیا میں طاقت ور اور کم زور دونوں طرح کے انسان آج بھی ہیں، کل بھی تھے اور آئندہ بھی رہیں گے۔ انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ طاقت ور اپنی طاقت کا غلط استعمال نہ کرے اور کم زوروں کے ساتھ محبت، ہمدردی، تعاون اور دست گیری کا رویہ اختیار کرے۔ جو طاقت ور ہے اس کی طاقت، کم زور کی کم زوری رفع کرنے اور اُسے اوپر اٹھانے میں صرف ہو، طاقت ور اسے اس قابل بنائے کہ زندگی کی دوڑ میں وہ پیچھے نہ رہ جائے، لیکن ماضی کی شہادت اور حال کا مشاہدہ ہے کہ زیادہ تر حالات میں فطرت کا یہ مطالبہ پورا نہیں ہوا۔ طاقت ور کے ہاتھ میں بے شمار حقوق اور اختیارات جمع ہوتے چلے گئے، کم زور کو ان کا بہت تھوڑا حصہ ملا یا بالکل نہیں ملا، طاقت ور کو طاقت کے نشہ میں اپنی ذمہ داریاں یاد نہیں رہیں اور کم زور، ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبنا چلا گیا، طاقت ور نے اپنے حقوق و اختیارات کا بے تحاشا استعمال کیا اور کم زور اپنی محرومی پر آنسو بہاتا رہا۔ کبھی تو اُسے مضبوط اور طاقت ور ہاتھوں نے اس طرح دبایا اور کچلا کہ سکے، تڑپنے اور فریاد کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ اس طرزِ عمل کا ایک شاخسانہ یہ رہا کہ مختلف ادوار میں اور زمین کے مختلف خطوں میں اصحابِ حقوق اور اصحابِ فرائض کے مستقل طبقات وجود میں آتے چلے گئے۔ ایک طرف وہ گرہ تھا جو گرد و پیش کے تمام وسائل کا مالک و مختار تھا اور دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو ہر چیز سے محروم تھا۔ ایک جانب

آسائش و راحت اور عیش و عشرت کا قص جاری تھا اور دوسری جانب زندگی اپنے وجود اور بقا کے لیے تڑپ رہی تھی، طاقت ور طبقہ کے ہاتھ میں اقتدار، حکومت، قانون، علم و فن، وسائل معیشت اور تہذیب و معاشرت سب کچھ تھا۔ اسی طبقہ سے فرماں رواں مملکت، امراء و رؤسائے سلطنت، فوجی جرنیل، علوم و فنون کے ماہر، تہذیب کے معمار اور سماج کے صورت گر پیدا ہوئے اور ہر در و بام کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے بالمقابل کم زور طبقہ ان میں سے کسی بھی چیز کا اپنے لیے تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ زندہ بھی تھا تو صرف اس لیے کہ طاقت ور طبقہ کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ بے روح مشین کی طرح اس کی قوت میں اضافہ کا سبب بنا رہا۔ طاقت ور ایسے بہت سارے حقوق کا مالک بن بیٹھا جن کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں فراہم کی جاسکتی۔ اور کم زور اپنے جائز حقوق سے بھی محروم تھا۔ وہ اس کے لیے جدوجہد کیا معنی اس کا ذکر بھی اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بعض اوقات اس کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا چلا گیا کہ دونوں طبقات نے اسے قانون فطرت سمجھ لیا۔ طاقت ور طبقہ نے سمجھا، یا اسے باور کرا دیا گیا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس کے ذاتی استحقاق کی بنا پر ہے اور بلا شرکت غیرے وہ اس کا مالک و مختار ہے اور کم زور طبقہ اپنی محرومی پر قانع و صابر ہوتا چلا گیا کہ یہی اس کی قسمت میں ازل سے لکھا گیا ہے۔ کبھی ان کے درمیان کشمکش اور تصادم بھی رہا ہے، بغاوت بھی ہوئی ہے، لیکن صورت حال میں بہت زیادہ تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ تصویر جتنی بھیانک ہے اسی قدر بھیانک یہ سوال ہے کہ کیا نوع انسانی کی تاریخ ظلم و ستم ہی کی تاریخ ہے؟ کیا اس نے عدل و انصاف اور فضل و احسان کی فصل بہار کبھی نہیں دیکھی؟ کیا اس طویل مدت میں اولادِ آدم کی اکثریت اپنے حقوق سے بے خبر اور نا آشنا ہی رہی یا ان سے محرومی ہی اس کے حصہ میں آئی؟ کیا ان حقوق کی حمایت میں کبھی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اور ان کے لیے جدوجہد کرنے والے اور حق دار کو حق دلانے اور اسے ادا کرنے والے پیدا ہی نہیں ہوئے؟

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں بعض بنیادی خامیاں بھی ہیں۔ ان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ان خامیوں کی وجہ سے اس سے متوقع نتائج برآمد نہیں ہو پارہے ہیں۔

اس منشور کے پیچھے کوئی قوت نافذ نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی ایسی بالاتر قوت نہیں ہے جو کسی قوم کو اس کا پابند بنائے۔ اس پہلو سے بعض اوقات اس کی حیثیت محض پند و نصیحت اور اخلاقی تلقین کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں بھی جو اسے ایک مقدس صحیفہ سمجھتے اور اس کے گن گاتے رہتے ہیں، حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے واقعات بہ کثرت ہوتے رہتے ہیں۔ ان حقوق کی نگرانی کرنے والے دنیا میں بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں اور مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں ایک European Court of Human Rights ہے۔ اس میں یورپ کے ممالک حقوق انسانی کی پامالی کے مقدمات درج کراتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔

ان مہذب ممالک میں داخلی طور پر حقوق انسانی کی خلاف ورزی جس پیمانہ کی ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ بین الاقوامی سطح پر وہ اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ طاقت ور اقوام کو، جنہیں ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے، ان حقوق کا پابند بنانا کم زور قوموں کے بس کی بات نہیں ہے۔ الجیریا، فلسطین، کوسوو، بوسنیا، عراق وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ فلسطین میں جس طرح حقوق انسانی کی پامالی ہو رہی ہے اسے اقوام متحدہ کی جانچ ٹیم کے ذمہ داروں نے تسلیم کیا ہے۔

یہ منشور فرد اور ریاست کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تعین نہیں کرتا۔ اس سے یہ بات واضح نہیں ہے کہ فرد کے حقوق کے حدود کیا ہیں اور کہاں سے ریاست کے اختیارات شروع ہوتے ہیں؟

مذہب کے معاملے میں بھی اس کا رویہ غیر واضح ہے۔ اس میں فرد کو کسی بھی

مذہب کے اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے کا حق دیا گیا ہے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ مذہب انسان کے حقوق و فرائض کا بھی تعین کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ ان پر عمل کر سکتا ہے؟ اگر نہیں کر سکتا یا خاص دائرہ ہی میں کر سکتا ہے تو مذہبی آزادی کے کیا معنی ہیں؟

یہ منشور اس تصور کے تحت وجود میں آیا ہے کہ انسان آزاد ہے اور وہ اپنے لیے خود قانون بنا سکتا ہے۔ اسے کسی آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک غیر مذہبی یا سیکولر منشور ہے۔ اس میں فطری طور پر سیکولر نظریات کے ابھرنے، اس نوع کی تحریکوں کے قائم ہونے، فروغ پانے اور اس سے ہم آہنگ کردار کی تبلیغ و اشاعت کے زیادہ مواقع ہیں۔ عملاً یہی ہو بھی رہا ہے۔ حریت فکر اور فرد کی آزادی کے نام پر ہر معاملہ میں الحاد اور خدا بے زاری، وحی و رسالت اور آخرت کے انکار کا ذہن کار فرما ہے۔ مخرب اخلاق تحریکیں چلانے، دنیا کو ایک خاص تہذیب اور کلچر کا عادی بلکہ پابند بنانے کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ اسے ترقی اور روشن خیالی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کسی دینی تحریک کے چلانے اور دینی اور اخلاقی قدروں کی ترویج و اشاعت کے مواقع محدود سے محدود تر ہیں۔ اس کی گنجائش نکلے بھی تو اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہیں، ان کے خلاف ذرائع ابلاغ کے ذریعے فضا بنائی جاتی ہے اور ان کی بدترین تصویر پیش کی جاتی ہے۔ دقیانوسیت اور بنیاد پرستی کے الزامات لگا کر انھیں ناقابل قبول ٹھہرایا جاتا ہے اور موقع ملنے پر طاقت کے ذریعہ ان کو ختم کرنے کی بدترین تدبیریں بھی کی جاتی ہیں۔ آزادی فکر کے سارے دعوے یہاں ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج حقوق انسانی کا ہر طرف چرچا ہے اور اس سلسلے میں بعض اچھی اور قابل تعریف مساعی بھی ہو رہی ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان حقوق کی خلاف ورزی بھی آئے دن ہوتی رہتی ہے اور اسے روکنے کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔

اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے۔ وہ دنیا اور آخرت کی فوز و فلاح کا ضامن ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ انسانی حقوق کا پاسبان اور محافظ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور ان حقوق کی پامالی کو روکنے کی موثر تدابیر اختیار کرتا ہے۔ یہ محض عقیدت و محبت یا جذباتی تعلق کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے جس وسعت اور گہرائی، بصیرت اور ژرف نگاہی سے اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، اس کی نظیر دنیا کے کسی منشور اور کسی دستور میں نہیں پائی جاتی۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ دنیا نے بہت سے معاملات میں جس طرح اسلام سے اکتساب فیض کیا ہے اسی طرح اس معاملہ میں بھی اس کی خوشہ چیں ہیں، البتہ اس کے اعتراف کی ہمت یا ظرف ابھی اسے حاصل نہیں ہے۔ اسلامی فکر کا پورا تتبع نہ ہونے کی وجہ سے موجودہ ذہن افراط و تفریط اور بے اعتدالی کا شکار ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی نشان دہی کی جائے اور اسلامی فکر میں جو اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے اسے نمایاں کیا جائے۔

اسلام انسانی حقوق کا پاسبان

بنیادی تضرّات

بنیادی تصوّرات

اسلام اس تصور کے خلاف ہے کہ انسان ایک طویل عرصہ تک ظلمت اور تاریکی میں رہا، پھر آہستہ آہستہ اسے علم و فکر کی روشنی ملی۔ اس کے نزدیک انسان اول بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے ساتھ اس زمین پر آباد ہوا۔ اس کے بعد ہر دور میں اس کی ہدایت اور رہنمائی کا انتظام ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اسے حقوق اللہ اور حقوق العباد سے باخبر کرتے رہے۔ انھوں نے ایک طرف یہ بتایا کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا کیا حق عائد ہوتا ہے، دوسری طرف بندوں کے حقوق کی وضاحت کی۔ ان کی تعلیمات میں خدائے واحد کی عبادت سے لے کر حسب حال نظام شریعت بھی رہا ہے۔ اگر انسان نے خدا کا حق ادا نہیں کیا تو اس پر انھوں نے تنقید کی۔ شرک کو مٹایا اور توحید کو قائم کیا۔ انسان نے انسان کے حقوق پر شب خون مارا تو اس کے خلاف بھی انھوں نے آواز اٹھائی، ظلم و ناانصافی کے خاتمہ اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے ان کی مساعی جاری رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اقتدار عطا کیا تو حق دار کو اس کا حق دلایا اور سماج میں عدل و انصاف کو عملاً قائم کیا۔ انسان کی تاریخ کے ساتھ وحی و رسالت کی تاریخ جڑی ہوئی ہے۔ اس سے صرف نظر کر کے اس کا مطالعہ ناقص اور ادھورا ہوگا۔

اسلام نے انسان کو کیا حقوق دئے ہیں اور کس حد تک دئے ہیں اس کے تفصیلی مطالعہ سے پہلے خود انسان کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کو سمجھنا ہوگا۔ اس

لیے کہ یہ سارے حقوق اسی نقطہ نظر کے تابع ہیں۔ وہ اس کے فطری اور منطقی نتائج کے طور پر ابھرتے اور اسی کی بنیاد پر تفصیلی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے پہلے اس بات کی کوشش ہوگی کہ انسان کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کی وضاحت ہو جائے، اس کے بعد اس کے حقوق کا ذکر ہوگا۔

۱۔ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے

اسلام اس حقیقت کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ زمین و آسمان اور یہاں کی ہر چیز اس کی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے۔ اس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔ انسان اس زمین پر اس کا خلیفہ اور نائب ہے (البقرہ: ۳۰)۔ اس کا کام اس کے احکام کی تعمیل اور ان کا نفاذ ہے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ اس حقیقت پر ایمان لانے اور اسے تسلیم کرنے سے سماجی زندگی میں زبردست انقلابی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز پر سے کسی فرد واحد، خاندان یا ادارہ کی مطلق ملکیت اور اجارہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ انسان یہ مان کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اصل مالک وہی ہے۔ وہ اس کے استعمال میں اس کی مرضی اور اس کے احکام کا پابند ہے۔ اس میں آزادانہ تصرف اس کے لیے ناجائز ہے۔ یہاں جو شخص جس حیثیت میں ہے اسی حیثیت میں اس کا امتحان ہو رہا ہے۔

وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کے مقابلے میں بعض کے درجات بلند کیے تاکہ تم کو ان چیزوں میں آزمائے جو اس نے تمہیں عطا کی ہیں۔ بے شک تمہارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ غفور و رحیم ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ
وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ
لِّيَلْوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۚ إِنَّ رَبَّكَ
سَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ
رَّحِيمٌ ۝ (الانعام: ۱۶۵)

یہ ایک واضح اعلان ہے کہ اس دنیا میں جس فرد یا گروہ کو اللہ تعالیٰ نے حکومت و اقتدار، شرف و منزلت اور مال و دولت سے نوازا ہے یہ اس کے امتحان کے لیے ہے۔ اس کے ذریعہ اسے آزمایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کا کس طرح استعمال کرتا ہے اور کم زوروں، محکوموں، محتاجوں اور بے کس لوگوں کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہے۔ اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کا اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔

یہی بات مختصر الفاظ میں اس آیت میں کہی گئی ہے:

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ
لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا
وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ
(الملک: ۲)

وہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون زیادہ اچھے عمل کرتا ہے اور وہ زبردست ہے اور بخشنے والا ہے۔

۲۔ انسان کا وجود اللہ کی مشیت کے تابع ہے

اس دنیا میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فرما ہے، یہاں جو انسان بھی پیدا ہوتا ہے اسی کی مشیت سے پیدا ہوتا ہے، وہ اس کے لیے کم یا زیادہ جتنی حیاتِ مستعار چاہتا ہے عطا کرتا ہے پھر اسی کے فیصلے کے تحت انسان یہاں سے اٹھا لیا جاتا ہے اور اس کا سفر آخرت شروع ہو جاتا ہے۔

يَأْتِيهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ
مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ
ثُمَّ مِّنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِّنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِّنْ
مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُّخَلَّقَةٍ
لِّنَبِّئَنَّ لَكُمْ وَنُقَرُّ فِي الْأَرْحَامِ
مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى

اے لوگو! اگر تم کو بعث بعد الموت کے بارے میں شک ہے (تو دیکھو) کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر لوتھڑے سے پھر مضغہ گوشت سے جس کا نقشہ مکمل اور نامکمل ہوتا ہے تاکہ اپنی قدرت تم پر واضح کر دیں اور ہم تم کو ماؤں کی رحموں میں جب تک چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رکھتے

بنیادی تصورات

ہیں پھر ہم تم کو حالت طفلی میں نکالتے ہیں
پھر جوانی کی عمر تک لے جاتے ہیں تاکہ تم
جوانی کے زور اور قوت تک پہنچو۔ تم میں سے
کسی پر موت آ جاتی ہے اور کوئی ارذل عمر کو
لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد کچھ نہ
جاننے کی حالت کو پہنچ جائے۔

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لَتَبْلُغُوا
أَشَدَّكُمْ ۖ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُتَوَفَّى
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْدَلِ الْعُمُرِ
لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا
(الحج: ۵)

یہی حقیقت سورہ مومن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا،
پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر
وہ تم کو بچہ کی حالت میں نکالتا ہے پھر
مہلت دیتا ہے کہ تم (اپنی جوانی کے)
زور کو پہنچ جاؤ۔ پھر تم بوڑھے ہو جاؤ۔ تم
میں سے کوئی اس سے پہلے ہی وفات
پا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ تم ایک مقررہ
وقت تک پہنچو اور شاید تم غور و فکر کرو۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ
يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لَتَبْلُغُوا
أَشَدَّكُمْ ثُمَّ لَتَكُونُوا شُيُوخًا
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُتَوَفَّى مِنْ قَبْلُ
وَلَتَبْلُغُوا أَجَلَ مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ
تَعْقِلُونَ ۝ (المؤمن: ۶۷)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور موت و حیات کے سلسلے میں اس کی
حکمت اور فیصلہ کا ذکر ہے کہ وہ جس شخص کو جتنی زندگی عطا کرنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔
کوئی عہد طفلی ہی میں ختم ہو جاتا ہے، کوئی عین دور شباب میں اس دنیا سے کوچ کر جاتا
ہے اور کوئی بڑھاپے کی منزل تک پہنچ کر موت کی آغوش میں پہنچتا ہے۔ اس سے یہ
استدلال کیا گیا ہے کہ خدا کی قدرت سے آخرت کا آنا بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ
بات بھی نکلتی ہے کہ جس شخص کو جتنی زندگی ملتی ہے وہ اللہ کی دین ہے۔ جب تک اللہ
چاہے اسے زندہ رہنے کا حق ہے۔ کوئی اسے اس حق سے محروم کرتا ہے تو بہت بڑے جرم
کا ارتکاب کرتا ہے۔

۳۔ کائنات سے استفادہ کا ہر شخص کو حق ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ وسیع کائنات انسان کے لیے انتہائی موزوں بنائی ہے۔ اس میں اس کی حیاتِ دنیا کا بہترین ساز و سامان ہے۔ بحر و بر اس کے لیے مسخر کر دیے گئے ہیں۔ زمین اس کے لیے مستقر ہے۔ وہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ اس پر رہ سکے اور زندگی گزار سکے، وہ یہاں کی ہوا اور پانی سے، سورج کی گرمی اور چاند کی ٹھنڈک سے، شب و روز کی گردش سے، سمندر کی گہرائی اور دریا کی روانی سے فائدہ اٹھا سکتا اور اسے اپنی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حق دیا ہے کہ وہ بہ حیثیت انسان بغیر کسی روک ٹوک کے اس کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضَ وَانْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ
مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ
رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ
الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ
بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْإِنْهَارَ
وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
دَآئِبِينَ وَ سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ
وَالنَّهَارَ وَ أَتَكُم مِّنْ كُلِّ مَا
سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ
اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ
لَظَلُومٌ كَفَّارٌ (ابراہیم: ۳۲-۳۴)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو
پیدا کیا اور آسمان سے پانی اتارا اور اس
کے ذریعے تمہارے لیے پھلوں کا رزق نکالا
اور تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر کیا تاکہ
سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور
تمہارے لیے نہریں مسخر کیں اور تمہارے
لیے سورج اور چاند کو مسخر کیا جو ہمیشہ گردش
میں ہیں اور تمہارے لیے رات اور دن کو
مسخر کیا اور تمہیں وہ سب چیزیں دیں جو تم
نے (تمہاری فطرت نے) طلب کیں۔
اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں
کر سکتے۔ بے شک انسان بڑا ظالم اور بڑا
ناشکر ہے۔

یہی بات ایک اور جگہ ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے وہ ساری چیزیں مسخر کر دیں (خدمت میں لگا دیں) جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝ (لقمن: ۲۰)

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اس دنیا میں بے شمار نعمتیں پیدا کی ہیں اور اسی نے ان سے فائدہ اٹھانے کا اسے حق بھی دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں کو کوئی اس سے سلب نہیں کر سکتا۔ اگر سلب کرتا ہے تو بدترین ظلم کا ارتکاب اور اپنے حدود سے تجاوز کرتا ہے۔

۴۔ انسان صرف ایک خدا کا بندہ ہے

انسان خدائے واحد کا بندہ ہے۔ اسی کی بندگی اور اطاعت اسے کرنی چاہیے۔ وہ یہاں کسی کا غلام نہیں ہے، لہذا اس کا حق ہے کہ وہ ہر غلامی سے آزاد ہو اور فی الواقع اسے آزاد ہونا بھی چاہیے۔ کسی فرد بشر کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کسی فرد کو اپنا غلام بنائے اور اپنی بندگی پر اسے مجبور کرے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اس نے ان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اس سے کہا کہ وہ خدا کے رسول ہیں اور خدا کی عبادت کی دعوت دے رہے ہیں۔ ان کی دعوت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کو جس عذاب میں اس نے ڈال رکھا ہے وہ اس سے باز آ جائے اور انھیں مصر سے ہجرت کر جانے دے۔ اس کے جواب میں فرعون نے اپنے ان احسانات کا ذکر کیا جو اس نے حضرت موسیٰ پر ان کے ابتدائی دور میں کیے تھے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

و تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنَّهَا عَلَيَّ أَنْ
عَبَدْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝
اور یہ احسان جو تو مجھ پر جتا رہا ہے وہ اس
وجہ سے تھا کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا
رکھا تھا۔ (الشعراء: ۲۲)

اگر فرعون نے حضرت موسیٰ پر کوئی احسان کیا بھی تھا تو کسی فردِ واحد کے ساتھ
ہم دردی اور انسانیت کا برتاؤ اس امر کا جواز نہیں فراہم کرتا کہ اس کی پوری قوم کو جبر کے
شکبہ میں کس لیا جائے اور غلامی کی زندگی پر اسے مجبور کیا جائے۔ اس کی آزادی کا حق
اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جس احسان کا تو ذکر کر رہا
ہے اس کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ اس غلام قوم کی نسل کشی کی جو تدبیر تو کر رہا تھا، اس
سے میں محفوظ رہا اور تو سمجھ نہ سکا کہ میں بھی اسی قوم کی اولاد ہوں۔

حضرت موسیٰ کی دعوت اور بنی اسرائیل کی آزادی کے مطالبہ کو فرعون نے
حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ اس نے کہا موسیٰ (اور ان کے بھائی ہارون) کا تعلق تو ہماری
غلام قوم سے ہے۔ انھیں ہم کیسے اللہ تعالیٰ کا رسول اور اپنا راہ نما مان سکتے ہیں؟ فرعون
اور اس کی قوم کا نسلی غرور اللہ تعالیٰ کی ہدایت قبول کرنے کی راہ میں مانع ہوا اور وہ غرقِ
دریائے نیل کر دیے گئے۔

انھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں
(حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون) پر ایمان لے
آئیں جب کہ ان کی قوم ہماری ماتحت اور تابع دار
ہے پس ان لوگوں نے ان دونوں کی تکذیب کی اور
ان قوموں میں شامل ہو گئے جو ہلاک کر دی گئیں۔

فَقَالُوا أَأَتُومِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا
قَوْمُهُمَا لَنَا عِبَادُونَ ۝ فَكَذَّبُوهُمَا
فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلِكِينَ ۝
(المؤمنون: ۴۷، ۴۸)

یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون کسی فرعونِ وقت کو برداشت نہیں
کرتا۔ حکومت و اقتدار اس لیے نہیں ہے کہ ایک طبقہ دوسرے کو محکوم اور غلام بنائے
رکھے۔ ریاست میں کسی کا حق دوسرے سے کم نہیں ہے۔ سب کے حقوق یکساں ہیں۔
حکومت ان حقوق کی پاسبان ہے نہ کہ غارت گر۔

۵- مذہبی غلامی کا جواز نہیں ہے

سیاسی غلامی کے ساتھ مذہبی غلامی کا بھی اسلام مخالف ہے۔ اس نے پاپائیت اور برہمنیت جیسے مذہبی اداروں کو ختم کیا اور یہ بتایا کہ انسان خدا سے اس کے پیغمبروں کی ہدایت کے تحت براہِ راست تعلق قائم کر سکتا، اسے یاد کر سکتا، اس کی عبادت کر سکتا، اس کے لیے نذر و نیاز اور قربانی پیش کر سکتا ہے۔ مشکلات میں اس کی طرف رجوع کر سکتا اور اس سے دعائیں کر سکتا ہے۔

جب تم سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو بتا دو کہ میں قریب ہوں۔ دعا کرنے والا جب دعا کرتا ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔ پس ان کو بھی میرا حکم ماننا چاہیے اور مجھ پر ایمان لانا چاہیے۔ اس سے امید ہے کہ وہ ہدایت پائیں گے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝

(البقرة: ۱۸۶)

اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لیے کسی دیوی، دیوتا، یا کسی پوپ، پنڈت اور پروہت کے واسطے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سن لو! اللہ ہی کے لیے ہے بندگی جو خالص ہو، جن لوگوں نے اسے چھوڑ کر حمایتی بنا رکھے ہیں ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں خدا سے قریب کر دیں۔ بے شک اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور حق کو نہ ماننے والا ہو۔

أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ۝

(الزمر: ۳)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسان کو سیاسی اور مذہبی کسی بھی حیثیت سے

محکوم بنانا قطعاً ناجائز ہے، اس کا حق ہے کہ اسے آزادی کی نعمت ملے اور وہ کسی فرد یا ادارے کا غلام نہ رہے۔

۶۔ انسان محترم ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی دوسری بے شمار مخلوقات پر شرف و فضیلت عطا کی ہے۔
وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَهُمْ
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَهُم مِّنَ
الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ
مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا
ہم نے بنو آدم کو عزت دی اور خشکی اور
تری کے لیے ان کو سواری دی اور ان کے
کھانے کے لیے پاک چیزیں عطا کیں
اور اپنی مخلوقات میں سے بیشتر پر ان کو
فضیلت عطا کی۔ (الاسراء: ۷۰)

انسان کو دوسری مخلوقات پر جو شرف و فضیلت حاصل ہے، اس کے بعض پہلوؤں کا خود قرآن مجید نے صراحتاً ذکر کیا ہے اور بعض کی طرف اشارات کیے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین خلقت عطا کی ہے۔ وہ اپنی جسمانی ساخت،
شکل و صورت، قد و قامت، اعضاء و جوارح کے تناسب اور ظاہری ہیئت کے لحاظ سے
دنیا کی حسین ترین مخلوق ہے۔ سورہ تین میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ
تَقْوِيمٍ
ہم نے انسان کو بہت خوبصورت طریقہ
سے پیدا کیا ہے۔ (التین: ۴)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ صَوَّرَكُمُ فَاَحْسَنَ صُورَكُمْ
اس نے تمہاری صورت گری کی اور تمہیں
بہت اچھی شکل و صورت عطا کی۔ (التغابن: ۴)

ایک اور موقع پر فرمایا:

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوِّكَ
فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا
وہ خدا جس نے تجھے پیدا کیا۔ تیرے
اعضاء و جوارح کو ٹھیک کیا۔ ان میں

شَاءَ رَكْبَكَ ۝

توازن اور اعتدال رکھا اور جس صورت

(الانفطار: ۴) میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

وہ حیوان ناطق ہے، اسے قوتِ گویائی عطا کی گئی ہے، وہ بولنے کی صلاحیت رکھتا اور اپنی زبان کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا ہے۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝
(الرحمن: ۳، ۴) اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے گویائی سکھائی۔

قلم کے ذریعہ بھی وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ (العلق: ۴) جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔

یہ امتیاز کسی جانور کو حاصل نہیں ہے کہ وہ زبان و قلم کا مالک ہو اور ان کے ذریعہ اپنے خیالات دوسروں تک منتقل کر سکے۔ یہ چیز انسان سے چھین جائے تو وہ جانور کی سطح پر آ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے اچھے جسم کے ساتھ دل و دماغ بھی عطا کیا ہے۔

وَجَعَلْ لَّكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ
وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝
(السجدة: ۹) اس نے تمہیں کان، آنکھ اور دل عطا کیے
لیکن تم بہت کم اس کا شکر ادا کرتے ہو۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ
أُمْهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا ۖ وَجَعَلَ
لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝
(النحل: ۷۸) اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے
نکالا کہ تم کوئی چیز نہیں جانتے تھے۔ (پھر)
اس نے تمہیں کان، آنکھیں اور دل عطا
کیے۔ (جن کے ذریعے تم بہت سی چیزوں کو
جاننے لگے) تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔

وہ سوچنے، سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ واقعات سے نتائج
اخذ کرتا اور نئے تجربات کرتا ہے۔ جدید سے جدید تر صنعت و حرفت اس کی مرہون

منت ہے۔ حیرت انگیز ایجادات و اختراعات اس کے ذریعہ جنم لیتے ہیں اور وہ اپنے لیے نئے نئے وسائل حیات تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس طرح مادی ترقی اور خوش حالی کی طرف اس کی پیش رفت ہوتی رہتی ہے۔

عقل کے ذریعہ انسان برے بھلے کے درمیان فرق کرتا ہے، اعمال کے حسن و قبح اور درست و نادرست کا فیصلہ کرتا ہے، معاملات میں اپنی رائے قائم کرتا اور اپنی مرضی سے کسی ایک پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ یہی خوبی انسان کو ایک ذمہ دار فرد بناتی ہے۔

یہ انسان کی عزت و تکریم کے بعض پہلو ہیں۔ ان کی خلاف ورزی اس عزت و تکریم کے منافی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے، اس کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرنا سراسر ظلم ہوگا جس کی وجہ سے اس کا مقام انسان کی سطح سے گر کر جانور کی سطح تک پہنچ جائے۔ اسلام ہر اس چیز کا مخالف ہے جو احترام آدمیت سے متصادم ہے۔ فقر و فاقہ، غذا کی کمی یا ناپاک اور گندی غذاؤں کے استعمال پر اس کا مجبور ہونا، غیر معمولی اور ناقابل برداشت محنت و مشقت کا بوجھ اس پر ڈالنا، اس کے لیے طبی سہولیات کا نہ ہونا، یا ایسی سزائیں دینا جس سے اس کا جسم اپنی فطری ساخت کھو بیٹھے، یہ سب اس کے خلقی حسن کو بگاڑنے کے ہم معنی ہے۔ اسلام اس غیر انسانی روش کی کسی حالت میں اجازت نہیں دیتا، اسی طرح انسان کو علم کی روشنی سے محروم رکھنا، ایسا رویہ اختیار کرنا جس سے اس کی فکر کو بالیدگی نہ مل سکے اور اس کی دماغی اور فکری صلاحیتیں منجمد ہو کر رہ جائیں اور اس کی زبان اور قلم پر پابندی لگانا ناروا ہے۔ یہ سب انسان کی تکریم کے لازمی تقاضے ہیں۔ اسلام ان سب کی بہ حسن و خوبی تکمیل چاہتا ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ فرماں روا ہے حقیقی ہے

انسان اجتماعیت پسند ہے۔ سب سے کٹ کر الگ تھلگ زندگی گزارنا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ وہ سماج کا ایک حصہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ سماج

اس کی بنیادی ضرورت بھی ہے، اس کی ضروریات زندگی اسے سماجی زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ دوسروں کے تعاون ہی سے اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ کچھ حقوق رکھتا ہے اور اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اس کے ان حقوق کو ادا کرنا ہر مہذب سماج کے لیے لازم ہے اور جو ذمہ داریاں سماج کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انہیں پوری کرے۔ یہ حقوق اور ذمہ داریاں فرد پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ خاندان، سماج اور قبیلہ کا بھی اس میں حصہ ہے اور ریاست کو بھی اس میں اپنا کردار ادا کرنا لازمی ہے۔

ان حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کون کرے گا؟ کیا فرد خود سے اس کا تعین کرے گا یا کسی دوسرے فرد کو اس کا حق حاصل ہوگا یا معاشرہ کی روایات سے اس کا تعین ہوگا یا ریاست اس کا فیصلہ کرے گی یا ان میں سے ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے اور سب مل کر اس کا فیصلہ کریں گے؟ اسلام اعلیٰ کا جواب یہ دیتا ہے کہ اس کے تعین کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ وہی قانون ساز ہے، قانون دینے کا حق اسی کو حاصل ہے، وہی ہر ایک کا حق بھی متعین کرتا ہے اور ذمہ داریاں بھی واضح کرتا ہے۔ فرد، سماج اور ریاست سب اس کے پابند ہیں۔ قانون سازی کا حق اس نے نہ کسی فرد کو دیا ہے، نہ کسی مذہبی شخصیت اور ادارہ کو اور نہ معاشرہ اور ریاست کو۔ بعض اوقات انسانی قانون کو مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اسلام نے اسے غلط اور باطل قرار دیا ہے۔

اہل عرب نے خود سے چیزوں کو حلال یا حرام قرار دے کر اسے خدا کے قانون کی حیثیت دے رکھی تھی۔ اس پر قرآن نے سخت تنقید کی اور کہا کہ یہ صرف اللہ کا اختیار ہے کہ وہ کسی چیز کی حرمت یا حلت کا فیصلہ کرے۔ کسی کا خود سے یہ کام کرنا اور اسے اللہ کی طرف منسوب کرنا اس کی جناب میں تہمت اور افترا پردازی ہے۔ اس کے مرتکب، دنیا اور آخرت میں فلاح نہیں پائیں گے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ السِّتُّكُمْ
الْكَذِبَ هَذَا حَلَلٌ وَ هَذَا حَرَامٌ
لَتَفْتُرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ
الَّذِينَ يَفْتُرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ
لَا يُفْلِحُونَ ○ (النحل: ۱۱۶)

تمہاری زبانیں جو جھوٹ بولتی ہیں اس کی
بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال اور یہ حرام ہے۔
اس طرح تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے
جو لوگ اللہ پر جھوٹی افترا پردازی کرتے
ہیں وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔

یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء فقہاء اور مشائخ کو مطلق قانون سازی کا حق دے
رکھا تھا۔ وہ جواز و عدم جواز کے آزادانہ فیصلہ کرتے۔ وہ جس چیز کو جائز کہتے وہ جائز
ہو جاتی اور جس چیز کے ناجائز ہونے کا فرمان صادر کرتے وہ ناجائز ہو جاتی۔ قرآن نے
اس پر سخت گرفت کی اور کہا کہ کسی عالم، فقیہ یا فقیر اور درویش کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ
شارع اور قانون ساز بن بیٹھے۔ یہ کام صرف اللہ کا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو شریعت اور
قانون عطا کرے۔

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ
أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحِ
ابْنِ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا
لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا لَا إِلَهَ إِلَّا
هُوَ سُبْحَنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○
(التوبة: ۳۱)

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے احبار اور
رہبان کو رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی
حالاں کہ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ الہ واحد
کی عبادت کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود
نہیں۔ پاک ہے اس کی ذات شرک سے
جس کا وہ ارتکاب کر رہے ہیں۔

اہل کتاب کو توریت عطا کی گئی اور یہ ہدایت کی گئی کہ اس کی روشنی میں زندگی
گزاریں اور اپنے معاملات کے فیصلے کریں۔ اس کے ابتدائی حاملین کا اس پر عمل تھا۔
انہوں نے اس کی پوری پابندی کی اور دنیا کے سامنے اس کے گواہ اور شاہد بن کر رہے۔
لیکن جب بگاڑ آیا تو خدا کی کتاب پیچھے چلی گئی اور اس سے آزاد فتووں اور فیصلوں نے
کتاب اللہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اسی سے ان کے کفر و ضلالت اور تباہی کا آغاز ہوا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ
يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا
لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّيُّونَ وَالْأَحْبَارُ
بِمَا اسْتَحْفَظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا
عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ
وَإِخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَتِي
ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا
أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْكَافِرُونَ ۝

ہم نے توریت نازل کی، اس میں ہدایت اور نور ہے۔ اسی کے مطابق انبیاء جو اللہ کے فرماں بردار تھے اور ان کے درویش اور عالم یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان سے اللہ کی کتاب کی حفاظت کا مطالبہ کیا گیا تھا اور وہ اس کی گواہی دینے والے بنائے گئے تھے۔ پس تم لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات کے ذریعہ ثمنِ قلیل نہ خریدو۔ جو لوگ ان احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے جو اللہ نے

(المائدة: ۴۴) نازل کیے ہیں وہی کافر ہیں۔

اس چیز نے کسی بھی فرد یا ادارہ کی مطلق بالادستی اور بے قید فرماں روائی کے تصور کو ختم کر دیا۔ اس نے کسی کو یہ حق ہی نہیں دیا کہ وہ دوسروں کے حقوق کا تعین کرے اور ان کی ذمہ داریاں بتائے۔ انسان خود بھی اپنے حقوق اور ذمہ داری کے تعین کا مجاز نہیں ہے۔ اس معاملہ میں ہر ایک کو خدا کے دیے ہوئے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

۸- اجتہاد کا حق حاصل ہے

یہاں اس قانون سازی کا ذکر نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود میں رہ کر ہوتی ہے۔ اس کی اجازت خود اس نے دی ہے۔ اسی کو تفقہ اور اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ کسی زندہ اور ابدی شریعت کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر وہ تغیر پذیر زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

منافقین کے بارے میں کہا گیا کہ وہ امن و خوف کی خبریں بلا تحقیق اس طرح پھیلاتے ہیں کہ ملک کا امن و امان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس معاملے میں صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَ إِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوْ
الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ
إِلَى الرَّسُولِ وَ إِلَىٰ أُولَى الْأَمْرِ
مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ
مِنْهُمْ ۖ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ
وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا
قَلِيلًا ۝ (النساء: ۸۳)

جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی
بات پہنچتی ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں۔ اگر
اسے وہ لوٹا دیتے رسول کی طرف اور اولو الامر
کی طرف جو ان میں اس کی تحقیق کر سکتے
ہیں تو وہ حقیقت حال سے باخبر ہوتے اگر تم
پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم
شیطان کے پیچھے چل پڑتے سوائے چند
ایک کے۔

اس میں واضح ہدایت ہے کہ ریاست کے نازک معاملات میں ظن و تخمین سے
کام لینے اور افواہیں پھیلانے کی جگہ اللہ کے رسول اور اولی الامر، جو معاملات کی تہہ تک
پہنچ سکتے ہیں، کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ
کی طرف اور ریاست کے ذمہ دار افراد کی طرف رجوع کرنے کا حکم تھا۔ آپ کے بعد
آپ کی ہدایات اور 'اولو الامر' کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ صحیح
صورت حال سے امت کو باخبر کریں، اولو الامر میں امراء و حکام کے ساتھ علماء و فقہاء بھی
آتے ہیں۔ اس لیے کہ دینی مسائل کا استنباط وہی کر سکتے ہیں اور حکام کی طرح ان کی
ہدایات بھی نافذ العمل ہوں گی۔^۱

یہ نازک حالات میں استنباط و اجتہاد مسائل کا صریح حکم ہے جو ہمیشہ جاری
رہے گا۔^۲

۹۔ اخلاق اور قانون کا تعلق

انسان کے اندر اخلاقی حس موجود ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے محبت اور پست اخلاق

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جصاص، احکام القرآن: ۲/۲۶۹-۲۷۲

۲۔ اجتہاد اور استنباط کی نازک حدود و شرائط ہیں۔ ان سے یہاں بحث نہیں ہے۔ انہیں جاننے
کے لیے اس فن کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

سے نفرت اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی وجہ سے چاہے ہزار اخلاقی خرابیاں اس کے اندر موجود ہوں وہ مکارم اخلاق کو پسند اور رذائل اخلاق کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کی یہ اخلاقی حس بیدار اور طاقت ور ہو جائے تو وہ تہذیب و شرافت کا نمونہ بن جائے اور کسی کو کسی سے شکایت نہ ہو۔ اسلام انسان کے اس جذبہ کو زندگی و توانائی عطا کرتا ہے۔ اس نے انسان کے حقوق کی سادہ سی فہرست نہیں فراہم کر دی ہے بلکہ اخلاق سے ان کا رشتہ جوڑ دیا ہے۔ بہت سے قانونی حقوق کو وہ انسان کی اخلاقی خوبیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، ان کی پابندی کی ترغیب دیتا ہے، ان کا اجر و ثواب بیان کرتا اور ان کی خلاف ورزی پر سخت وعید سناتا ہے۔ اس نے ان حقوق کے سلسلہ میں فرد کے ضمیر کو بیدار کیا اور سماج کے اندر اس کے حق میں فضا بنائی ہے۔ قتل نفس، قتل اولاد، سرقہ، بدکاری، دشنام طرازی، افتراء و تہمت، حق تلفی اور ظلم و زیادتی جیسی خرابیوں کو وہ فسق و فجور اور کبار میں شمار کرتا ہے اور اس پر سخت وعید سناتا ہے۔ ان کے بالمقابل جن پہلوؤں سے بھی آدمیت کا احترام ہو ان کی وہ تحسین کرتا اور ان کے اجر و ثواب کا ذکر کرتا ہے۔ اس طرح حقوق انسانی کی اس کے نزدیک مجرد قانونی حیثیت ہی نہیں ہے بلکہ انسان کے اعلیٰ اخلاقی کردار کی بھی ہے۔

۱۰۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس

اسلام نے ایک طرف تو انسانی حقوق کو قانونی اور اخلاقی تحفظ فراہم کیا اور دوسری طرف اس کے احترام کا جذبہ بیدار کیا۔ اس کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا قانون ہے اور اس کے بتائے ہوئے احکام ہیں۔ اس کے قائم کردہ حدود سے ان کا تعلق ہے۔ ان کی پابندی ہر حال میں لازمی ہے۔ اس سے انسان کل قیامت کے روز اللہ کے انعام و اکرام کا مستحق ٹھہرے گا اور ان کی خلاف ورزی پر خدا کے سامنے اسے جواب دہ ہونا پڑے گا اور وہ وہاں کے ہولناک عذاب سے دو چار ہوگا۔ اللہ کے نیک بندوں کی

ایک خوبی الْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ (التوبہ: ۱۱۳) ہے۔ یعنی وہ اللہ کے قائم کردہ حدود کی نگہداشت کرتے ہیں کہ ان سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ اسے بعض مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

وراثت میں قرابت داروں کے حقوق بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا ۚ وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝

یہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کے حدود سے تجاوز کرے تو اسے وہ نار جہنم میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہوگا۔

(النساء: ۱۳، ۱۴)

قرآن مجید نے ان حقوق کی پابندی کو قیامت کے عقیدہ سے جوڑ دیا ہے۔ یہ عقیدہ ان حقوق کی پامالی سے انسان کو باز رکھتا اور اسے ان کے احترام پر مجبور کرتا ہے۔ قتل ناحق قانونی جرم ہی نہیں گناہ کبیرہ ہے۔ ایک جگہ کہا کہ اہل ایمان شرک، قتل نفس اور عصمت دری کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس کے بعد فرمایا:

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ۖ يُضْعَفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَ يُخْلَدُ فِيهِ مُهَانًا ۝ إِلَّا مَنْ تَابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

جو ان کا ارتکاب کرے وہ گناہ (کی سزا) پائے گا قیامت کے روز اسے دو گنا عذاب دیا جائے گا۔ اس میں ذلیل و خوار ہو کر ہمیشہ پڑا رہے گا۔ ہاں! جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل صالح کیا تو ایسے لوگوں کی غلطیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

(الفرقان: ۶۸-۷۰)

دور جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ اس گھناؤنے جرم پر قرآن نے ان الفاظ میں تنقید کی۔

وَ إِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۖ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۖ (التکویر: ۸، ۹) کہ کس گناہ میں وہ ماری گئی۔

یتیم کے مال پر ناجائز قبضہ کی ممانعت کے بعد ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَ سَيَصْلُونَ سَعِيرًا ۝ (النساء: ۱۰) جو لوگ یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور جلد ہی جہنم میں داخل ہوں گے۔

ایک جگہ امانتوں کی ادائیگی کا حکم ہے۔ اس میں مالی امانتیں بھی شامل ہیں اور عہدہ و منصب کی امانتیں بھی۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ۚ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ (النساء: ۵۸) بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اصحاب امانت تک پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یقیناً اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

قیامت کے حساب کتاب اور آخرت کی جواب دہی کا احساس ابھر آئے تو انسانی حقوق کی خلاف ورزی شاید نہ ہو۔ اس احساس کا فقدان ہی ادائے حقوق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

فرد کے شخصی اور ذاتی حقوق

شخصی اور ذاتی حقوق

زندہ رہنے کا حق

فرد کے حقوق میں سب سے بڑا اور بنیادی حق اس کے زندہ رہنے کا حق ہے۔ اسی پر دوسرے حقوق کا انحصار ہے۔ یہ حق کسی سے سلب کر لیا جائے تو دوسرے حقوق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دنیا کے تمام جمہوری قوانین نے اسے ایک فطری اور بنیادی حق قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ یہ حق مطلق اور غیر مشروط نہیں ہے۔ عدل و انصاف اور جائز قانون کے تحت کسی کو اس حق سے محروم بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسلام نے انسان کو زندگی کا حق عطا کیا، اس پر دست درازی سے شدت سے منع کیا اور اسے پورا تحفظ فراہم کیا اور اعلان کیا کہ جب تک حق ہی کا مطالبہ نہ ہو اسے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے نزدیک ہر انسان جو یہاں پیدا ہوتا ہے زندہ رہنے کا حق لے کر پیدا ہوتا ہے۔ زندگی اسے اللہ کی طرف سے ملی ہے۔ وہی اس کا مالک ہے، اسے کوئی سلب کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنی زندگی ختم نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے خودکشی حرام ہے۔

اسلام نے اہل ایمان کا ایک نمایاں وصف یہ بیان کیا ہے کہ وہ ناحق کسی کی جان نہیں لیتے۔

وہ کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ حرام ٹھہرایا ہے،
قتل نہیں کرتے۔ سوائے اس کے کہ حق کا
تقاضا ہو۔

وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ
اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۝ (الفرقان: ۶۸)

صحیح بخاری کی حدیث ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ
رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الكبائر: الاشراك بالله و
عقوق الوالدين و قتل النفس
واليمين الغموس
كبار ہیں اللہ کے ساتھ شرک کرنا،
والدین کی نافرمانی کرنا، کسی نفس کو قتل کرنا
اور جھوٹی قسم کھانا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قتل نفس جیسے جرم کبیر سے اہل ایمان کا دامن پاک ہوتا
ہے اور پاک ہونا چاہیے۔

اسلام نے صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ انسان کب زندگی کے حق سے محروم
ہو جاتا ہے۔ وہ کون سے جرائم ہیں جن کے ارتکاب کے بعد وہ اپنے حق حیات کا
مطالبہ نہیں کر سکتا اور معاشرے کے لیے وہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ
فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ
النَّاسَ جَمِيعًا ۖ وَمَنْ أَحْيَاهَا
فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا
جو کوئی کسی نفس کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ
اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد
پھیلایا ہو، تو اس نے گویا سب انسانوں کو
قتل کیا۔ جس نے کسی نفس کو زندہ رکھا گویا

(المائدة: ۳۲) اس نے سب انسانوں کو زندہ کیا۔

یہ حکم بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا اور یہی اسلامی شریعت میں بھی باقی رکھا گیا ہے
کہ اگر آدمی کسی کا ناحق خون بہائے یا مملکت میں فساد پھیلانے اور کشت و خون کا بازار
گرم کرے تو اپنی جان کی حرمت ختم کر دیتا ہے۔ اس کا وجود صفحہ زمین پر ناقابل
برداشت ہے۔ اسے راستے سے ہٹا کر امن و امان بحال کرنا ریاست کا فرض ہے۔ اسے

۱۔ بخاری، کتاب الایمان والندور، باب الیمین الغموس

کسی پہلو سے غلط نہیں کہا جاسکتا۔

اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ کسی فرد واحد کا بھی ناحق خون بہانا ایک سنگین جرم ہے یہ ساری نوع انسانی کو خوں ریزی کی راہ پر لگانا ہے۔ اس کے برخلاف کسی مظلوم اور بے گناہ کی جان بچانا پورے عالم کے لیے حیات بخش ہے، اس لیے کہ اس سے انسانی جان کی قدر و قیمت کا سبق ملتا ہے۔ آدم کی اولاد میں جس نے پہلی بار اپنے بھائی کا ناحق خون بہایا، اس نے دوسروں کو یہ راہ دکھائی، اسی لیے جب کبھی زمین پر خون ناحق بہے گا، اسے اس میں شریک سمجھا جائے گا اور اس کے نامہ اعمال میں اس کا گناہ لکھا جائے گا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تقتل نفس ظلما الا كان على

کوئی شخص ظلم کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے تو

ابن ادم الاول كفل من دمها

اس پہلے ابن آدم پر بھی اس خون کا ایک

لأنه اول من سن القتل.

حصہ ہوگا جس نے قتل کیا تھا کیوں کہ اس

نے ناجائز قتل کا طریقہ دنیا کو دکھایا تھا۔

قتل ناحق کے سلسلہ میں اسلام نے حسب ذیل ہدایات دی ہیں:

۱۔ قاتل سے قصاص لیا جائے یعنی کسی نے ناحق قتل کیا ہے تو اسے قتل کر دیا

جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کسی دوسرے کو اس جرم کے ارتکاب کی ہمت نہ ہوگی۔ اسی لیے فرمایا گیا:

۲۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین جرائم ایسے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا قتل ہوگی۔ ایک ارتداد، دوسرا کسی بے گناہ کو قتل کرنا، تیسرا کسی شادی شدہ شخص کا بدکاری میں ملوث ہونا۔ عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لا يحل دم امرئ مسلم يشهد ان لا اله الا الله وأنى رسول الله الا باحدى ثلث النفس بالنفس والثيب الزانى والمارق لدينه التارك للجماعة۔ بخاری، کتاب الدیات، باب قوله تعالى النفس بالنفس۔ مسلم، کتاب القسامة، باب ما يباح به دم مسلم۔

۳۔ بخاری کتاب الانبياء، باب خلق آدم و ذريته۔ مسلم، کتاب القسامة، باب بيان اثم من سن القتل

تمہارے لیے اے عقل والو قصاص میں
زندگی ہے۔ امید ہے اس طرح تم اس کے
ارتکاب سے بچو گے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّٰۤاُولِی
الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝
(البقرة: ۱۷۹)

قصاص میں مقتول کے ساتھ قاتل کی بھی جان جاتی ہے۔ بہ ظاہر اس میں
مزید ایک فرد کا نقصان ہے لیکن اس میں پوری قوم کی حیات ہے۔ قانون قصاص پر صحیح
معنی میں عمل ہو تو اقدام قتل سے پہلے آدمی ہزار بار سوچے گا کہ اس کے بعد اسے بھی
اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس سے قتل ناحق کی راہ مسدود ہوگی اس میں صرف
دو افراد ہی کی زندگی نہیں ہے بلکہ پوری نوع انسانی کی حیات ہے۔

۲۔ اگر مقتول کے ورثاء چاہیں تو قصاص کی جگہ دیت لے سکتے ہیں اور انھیں
پوری دیت لینے اور اس میں کمی کرنے کا اختیار ہوگا۔ وہ قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں۔
معافی پسندیدہ عمل ہے۔ اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

۳۔ ان تمام معاملات کا اختیار مقتول کے اہل خاندان کو حاصل ہوگا۔
اسلام نے اسے ریاست کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا ہے۔ ریاست اس میں مقتول
کے ورثاء کو ان کا حق دلانے میں مدد دے گی اگر وہ قاتل کے ساتھ کوئی غیر شرعی اور
غیر انسانی رویہ اختیار کرنا چاہیں یا اس کے ساتھ خاندان کے دوسرے افراد کو انتقام کا
نشانہ بنانے کی کوشش کریں یا اور کسی قسم کی ظلم و زیادتی پر آمادہ ہوں تو اس کی انھیں
اجازت نہ ہوگی۔ قانوناً انھیں اس سے باز رکھا جائے گا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ
اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا
فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِیِّهِ سُلْطٰنًا فَلَا
یُسْرِفُ فِی الْقَتْلِ ۚ اِنَّهٗ كَانَ
مَنْصُوْرًا ۝
(الفرقان: ۶۸)

جس نفس کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے
اسے قتل نہ کرو اور جو کوئی ظلم سے قتل کیا
جائے تو ہم نے اس کے ولی کو حق اور اختیار
دیا ہے۔ لیکن وہ قتل میں حد سے آگے نہ
بڑھے۔ بے شک اس کی مدد ہوگی۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (بقرہ: ۱۷۸)

حق مساوات

مساوات کو انسان کا بنیادی حق ہی نہیں بلکہ تمام حقوق کی اساس کہا جاتا ہے۔ حقوق انسانی کے عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) میں جن حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ حقوق سب کو یکساں حاصل ہوں گے۔ اس میں نسل، رنگ، جنس (مرد اور عورت) زبان، مذہب، سیاسی یا دیگر افکار و خیالات، سماجی و معاشی حیثیت اور جائے پیدائش کی بنیاد پر فرق و امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ یہی بات بین الاقوامی سماجی و سیاسی معاہدہ (International Covenant on Civil and Political Rights) میں کہی گئی ہے۔

ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ان حقوق کو پامال نہ ہونے دے اور اس کے تقاضوں کو زندگی کے کسی بھی معاملہ میں متاثر ہونے سے بچائے۔^۱ دنیا نے مساوات کے تصور کو آج جتنی اہمیت دی ہے اسلام نے اسے اس سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ وحدت انسانیت اور مساوات کا تصور اس کی اساسی تعلیمات میں شامل ہے۔ اس نے اس وقت اسے اجاگر کیا جب کہ دنیا اس سے بے خبر اور نا آشنا تھی۔ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل، زبان، خطہ ارض، جنس، عہدہ اور منصب اور صنعت و حرفت وغیرہ کا فرق فطری طور پر پایا جاتا ہے، لیکن اس فرق کو انسان نے اپنی نادانی سے یہی نہیں کہ حقیقی فرق سمجھ لیا بلکہ اسے بلندی و پستی کا معیار بھی قرار دے دیا، کبھی اس نے سفید فام کو سیاہ فام سے اونچا قرار دیا، کبھی کسی خاص نسل کی دوسری نسلوں سے برتری کا تصور اس پر چھایا رہا، کبھی کسی زبان کے بولنے والوں کو دوسری زبان والوں سے برتر سمجھ بیٹھا، کبھی نوعی اور صنفی فرق اس کے نزدیک وجہ تفوق بن گیا اور عورت پر مرد کی برتری ناقابل نزاع بنی رہی، آج بھی مساوات کے ہزار دعوؤں کے باوجود یہ فرق باقی ہے۔ اسلام نے انسانوں کے درمیان فرق و امتیاز کے اس تصور پر کاری ضرب لگائی

^۱ ملاحظہ ہو: Human Rights International challenges volume one p.p.79-84

اور اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ انسانوں کے درمیان فرق و اختلاف دراصل باہم تعارف کا ذریعہ ہے، حقیقی فرق نہیں ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ معلوم ہو کس فرد کا کس سرزمین اور کس ملک سے تعلق ہے؟ وہ کون سی زبان بولتا ہے اور اس کی جنس کیا ہے؟ یہ تعارف اصلاً ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کا ذریعہ ہے۔ اگر سب کے رنگ روپ، شکل و صورت، قد و قامت، زبان اور بولی ایک ہوتی تو انھیں پہچانا نہ جاتا، انسانوں کے درمیان یہ تنوع قدرت کی نشانی ہے کہ اس نے اس تنوع اور رنگارنگی کے اندر نوع انسانی کی وحدت باقی رکھی ہے۔ یہ کثرت میں وحدت کی دلیل ہے۔ اختلاف و انتشار کی دلیل نہیں ہے۔

اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک تم میں سب سے بزرگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہے۔ یقیناً اللہ علیم وخبیر ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ
(الحجرات: ۱۳)

رسول اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے بعد جو خطبہ دیا، اس میں قومی اور نسلی برتری کے احساسات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور بتایا کہ آدم کی اولاد سب ایک حیثیت کی مالک ہے، ہاں تقویٰ، خدا ترسی اور رفعت کردار سے انسان عزت و سر بلندی کے مقام رفیع تک پہنچتا ہے اور وہ دوسروں کے لیے قابل احترام ٹھہرتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

اے لوگو! سن لو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ (بھی) ایک ہے۔ سن لو کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سفید کو کسی سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سفید پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقویٰ کے (جس کے اندر جتنا تقویٰ ہوگا اتنا ہی وہ صاحب فضیلت ہوگا)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ لَا إِنْ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَلَا إِنْ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ وَلَا فَضْلٌ لِعَرَبِيٍّ عَلَىٰ عَجْمِيٍّ وَلَا لِعَجْمِيٍّ عَلَىٰ عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرٍ عَلَىٰ أَسْوَدٍ وَلَا لِأَسْوَدٍ عَلَىٰ أَحْمَرٍ إِلَّا بِالتَّقْوَىٰ

شخصی اور ذاتی حقوق

یہ انسان کی مساوات کا واضح ڈیکلریشن تھا کہ کسی بھی فرد کو چاہے اس کا تعلق کسی بھی نسل و قوم سے ہو، کسی دوسری رنگ و نسل اور قوم کے فرد پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ برتری کا معیار صرف تقویٰ اور خدا ترسی ہے، جو جتنا خدا ترس ہے وہ اتنا ہی عزت و احترام کا مستحق ہے۔

انسانوں کے درمیان فرق و امتیاز اور ان پر ظلم و زیادتی خدا کی آتش غضب کو بھڑکاتی ہے اور جس قوم کو یہ مرض لگ جائے وہ بالآخر تباہ ہو جاتی ہے۔ فرعون اور اس کی قوم نسلی تعصب اور احساس برتری میں مبتلا تھی اور وہ بنی اسرائیل کو اپنے مساوی حیثیت دینے کے لیے تیار نہ تھی، اس نے انھیں غلام بنائے رکھا تھا اور انھیں محض خدمت گار کی حیثیت سے دیکھتی تھی، نسل کشی کے ذریعہ ان کی افرادی قوت گھٹانے اور انھیں کم زور کرنے کی مسلسل تدبیریں کر رہی تھی اور ان کے ابھرنے کے تمام مواقع اس نے مسدود کر رکھے تھے، کسی قوم کے ایک طبقہ کو اس طرح دبانا اور کچلنا سنگین جرم تھا۔ قرآن مجید نے اس ظلم کو جگہ جگہ نمایاں کیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی اس روش کے مقابلہ میں بنو اسرائیل جیسی کم زور قوم کو اوپر اٹھایا اور فرعون اور اس کی قوم اپنے انجام بد کو پہنچ کر رہی۔

بے شک فرعون نے ارض مصر میں سرکشی کی راہ اختیار کی اور وہاں کے باشندوں کو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک فرقہ (بنی اسرائیل) کو کم زور بنائے رکھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا۔ بے شک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ ہم ان لوگوں پر احسان کرنا چاہتے تھے جو زمین میں کم زور بنا کر رکھے گئے تھے، ان کو امام بنانا چاہتے

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَ
جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضِعُّ
طَائِفَةً مِنْهُمْ يَذِخُّ أبنَاءَهُمْ وَ
يَسْتَحْيِ نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ
الْمُفْسِدِينَ ۝ وَ نُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى
الَّذِينَ اسْتَضَعُّوا فِي الْأَرْضِ وَ
نَجْعَلَهُمْ أئِمَّةً وَ نَجْعَلَهُمُ
الْوَارِثِينَ ۝ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي

۱۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا رسالہ 'وحدت بنی آدم اور اسلام'

تھے اور ان کو زمین میں اقتدار دینا چاہتے
تھے اور فرعون، ہامان اور ان کے لشکروں کو
ان کے ذریعے وہی کچھ دکھانا چاہتے تھے
جس سے وہ ڈر رہے تھے۔

الْأَرْضِ وَ نُرِيْ فِرْعَوْنَ وَ
هَامَانَ وَ جُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا
يَحْذَرُونَ ○ (القصص: ۴-۶)

یہ اس بات کا واضح اعلان ہے کہ حکومت اور اقتدار کسی بھی طبقے یا گروہ کو غلام
بنانے کے لیے نہیں ہے۔ ریاست کا ہر فرد اور ہر گروہ اپنے حقوق رکھتا ہے، ریاست
اسے کسی بھی حیلے بہانے یا برتری اور کم تری کے جھوٹے احساسات کے تحت ختم نہیں
کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون اس جبر و تشدد اور فرعونیت کو برداشت نہیں کرتا۔

عدل و انصاف کا قیام

انسانوں کے درمیان مساوات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب کے ساتھ عدل و
انصاف ہو، کوئی بھی شخص ظلم و زیادتی کا ہدف نہ بنے پائے، اسلامی تعلیمات جن
اساسات پر قائم ہیں ان میں سے ایک اساس عدل و انصاف ہے۔ اسلام نے عدل و
انصاف کا تصور ابھارا اور اسے ایک زندہ اور فعال تصور بنایا۔ اس نے کہا کہ یہ دنیا عدل
پر قائم ہے، انسان کی زندگی بھی عدل ہی کی بنیاد پر درست ہو سکتی ہے، اس لیے اسے
عدل کا پابند ہونا چاہیے، انسان ظلم کی راہ پر چل پڑے تو معاشرہ لازماً بے چینی اور
اضطراب سے دو چار اور سکون سے محروم رہے گا۔ اس کی تگ و تاز عدل کے دائرے میں
ہو تو یہاں وہی امن و سکون ہوگا جو پوری کائنات میں نظر آتا ہے۔

سورج اور چاند کے لیے ایک حساب ہے
(کہ وہ اس کے مطابق گردش میں ہیں) اور
پودے اور درخت سجدہ کر رہے ہیں، اس نے
آسمان کو بلند کیا اور میزان رکھ دی کہ تم
میزان میں زیادتی نہ کرو۔ انصاف کے ساتھ
وزن کو قائم رکھو اور تولنے میں کمی نہ کرو۔

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ○
وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ○
وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ○
أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ○ وَ أَقِيمُوا
الْوِزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا
الْمِيزَانَ ○ (الرحمن: ۵-۹)

اللہ تعالیٰ کا پورا دین صدق و عدل پر قائم ہے۔

و تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَ
عَدْلًا ط (الانعام: ۱۱۵) اور باعتبار عدل۔^۱

مطلب یہ ہے کہ اس نے جو تعلیمات دی ہیں اور غیب کی جو حقیقتیں بیان کی ہیں وہ سب کی سب درست اور صحیح ہیں، ان کو غلط قرار دینے کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے اور اس نے جو احکام دیے ہیں وہ ہر طرح کے جور و ستم سے پاک اور سراسر عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔

پیغمبروں کی بعثت کا ایک اہم مقصد عدل و قسط کا قیام ہے۔ اسلام اس کے لیے طاقت کے استعمال کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَ
أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَ أَنْزَلْنَا
الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَ مَنَافِعُ
لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَ
رُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ط إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ
عَزِيزٌ (الحديد: ۲۵)

ہم نے اپنے رسول دلائل کے ساتھ بھیجے اور
ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ
لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا
اتارا۔ اس میں سخت لڑائی (کا سامان) ہے
اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے بھی
ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ بغیر دیکھے کون
اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔
بے شک اللہ زور آور اور زبردست ہے۔

اسلام جس معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے اس کا تصور عدل و انصاف کے بغیر نہیں
کیا جاسکتا۔ اس کی ہدایت ہے کہ ظلم و زیادتی کی روش سے پوری طرح احتراز کیا جائے
اور کسی بھی معاملہ میں اور کسی بھی حال میں قدم جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہ پائے۔ اس نے
عدل و انصاف کی ہدایت اور نبی و عدوان سے ممانعت ایک ساتھ کی ہے، اس لیے کہ یہ
ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ارشاد ہے:

۱۔ قال البيضاوي صدقا في الاخبار والمواعيد و عدلا في الاقضية والاحكام
(تفسير بيضاوي: ۱/۳۱۸ طبع بيروت ۱۹۸۸ء)

اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو (ان کا حق) ادا کرنے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی سے، منکر سے اور زیادتی اور سرکشی سے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ
وَإِيتَايِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ
يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝
(النحل: ۹۰)

حکم ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا رویہ اختیار کیا جائے۔ یہی

خدا ترس انسانوں کا طریقہ ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے ہو جاؤ۔ عدل و انصاف کے شاہد بن کر۔ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر ہرگز آمادہ نہ کرے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ
لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا
يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا
تَعْدِلُوا ۖ إِعْدِلُوا ۖ هُوَ أَقْرَبُ
لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ
خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (المائدة: ۸)

اسلام کے نزدیک اقتدار اور حکومت قیام عدل کا ذریعہ ہے۔ جس شخص کے

ہاتھ میں ریاست کی باگ ڈور ہے اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ ہے۔ وہ انصاف کو ہر حال میں قائم کرے گا اور نا انصافی سے اس کا دامن پاک ہوگا۔ اسلامی ریاست اپنے وسائل کو قیام عدل کے لیے استعمال کرے گی۔ حضرت داؤد کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

اے داؤد ہم نے تجھ کو زمین میں نائب بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کرو اور اپنی خواہش کے پیچھے نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔ بے شک جو لوگ اللہ کے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے

يٰۤاٰدٰدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى
الْاَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ

عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ
الْحِسَابِ ۝ (ص: ۲۶)

سخت عذاب ہے، اس لیے کہ انھوں نے
یوم حساب کو فراموش کر دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا۔

وَ إِنْ حَكَمْتَ فَأَحْكُم بَيْنَهُمْ
بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
الْمُقْسِطِينَ ۝ (المائدة: ۴۲)

اگر تم ان کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و
انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ
انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز امام عادل ان لوگوں میں ہوگا
جنہیں عرش الہی کے سایہ میں جگہ ملے گی جب کہ سوائے اس ایک سایہ کے اور کوئی سایہ
نہ ہوگا۔^۱

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا:

ان المقسطين عند الله على
منابر من نور عن يمين الرحمن
عز وجل وكلتا يديه يمين،
الذين يعدلون في حكمهم و
اهليهم وما ولوا^۲

بے شک انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے
نزدیک نور کے منبروں پر جلوہ افروز ہوں گے جو
رحمان عز وجل کے سیدھے ہاتھ کی طرف ہوں
گے اور اس کے دونوں ہی ہاتھ سیدھے ہیں۔
انصاف کرنے والے وہ ہیں جو اپنے فیصلوں
میں، اہل و عیال کے معاملہ میں اور جن کے وہ
والی اور نگران بنائے جائیں ان سب کے سلسلہ
میں انصاف کرتے ہیں۔

عدل و انصاف سے متعلق اسلام کی یہ واضح ہدایات ہیں۔ ان پر صحیح معنی میں
عمل درآمد ہو تو حق تلفی اور ظلم و زیادتی کی نیخ کنی ہو سکتی اور ہر طرح کے استحصال سے
پاک معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

۱ بخاری، کتاب الاذان، باب من جلس في المسجد ينتظر الصلوة الخ. مسلم،
کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقة

۲ مسلم. کتاب الامارۃ، باب فضيلة الامام العادل

قانون کی برتری

اسلام نے عدل و انصاف پر مبنی قانون ہی نہیں دیا بلکہ اس کی برتری بھی قائم کی۔ اس کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اس میں چھوٹے اور بڑے، امیر اور غریب کا فرق نہیں ہے۔ ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کے سامنے سر جھکا دے ورنہ یہ نفاق اور ایمان کی کم زوری کی دلیل ہوگی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۚ وَ مَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۝

یہ کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کا طریقہ نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر انھیں اپنے معاملہ میں اختیار باقی رہے، جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گم راہی

(الاحزاب: ۳۶) میں پڑ گیا۔

منافقین کے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کے قبول کرنے میں انھیں تاہل اور تردد ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ان کا خسارہ ہے، لیکن صحیح اور سچے اہل ایمان کا رویہ دوسرا ہوتا ہے۔ وہ سراپا سمع و طاعت بن جاتے ہیں اور اسے دل سے قبول کرتے ہیں۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَ مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَ يَخْشَ اللَّهَ ۖ وَيَتَّقْهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝

اہل ایمان کی بات یہ ہوتی ہے جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو بس وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ یہی فلاح پانے والے ہیں۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اللہ سے ڈرے اور اس کا تقویٰ اختیار کرے تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

(النور: ۵۱-۵۲)

قانون کی برتری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ بنو مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس قبیلہ کے لوگوں نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی کہ وہ آپؐ سے سفارش کریں کہ اسے قتلِ ید کی سزا نہ دی جائے۔ اس پر نبیؐ نے حضرت اسامہؓ پر، جو آپؐ کو اولاد کی طرح عزیز تھے، ناگواری کا اظہار کیا اور فرمایا:

أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللَّهِ

کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے

سلسلے میں سفارش کر رہے ہو۔

اس کے بعد آپؐ نے خطبہ دیا۔ اس میں ارشاد فرمایا:

انما اهلك الذين قبلکم انهم کانوا اذا سرق فيهم الشريف ترکوه و اذا سرق فيهم الضعیف اقاموا علیه الحد۔

تم سے پہلے کے لوگوں کو جس چیز نے تباہ کیا وہ یہی تھی کہ جب ان میں سے کوئی شریف اور معزز فرد چوری (یا اور کسی جرم کا ارتکاب کرتا) تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کوئی کم زور چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کر دیتے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد آپؐ نے قانون کی برتری کے سلسلے میں وہ الفاظ ادا فرمائے جو پیغمبر ذی شان ہی کی زبان سے ادا ہو سکتے تھے۔ فرمایا:

و أيم الله، لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها۔

خدا کی قسم اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ قطع کر دیتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

من حالت شفاعته دون حد من حدود الله فقد ضاد الله۔

جس کسی کی سفارش اللہ تعالیٰ کے حدود میں سے کسی حد کے نفاذ میں حائل ہو جائے اس نے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی۔

۱ بخاری، کتاب الانبیاء باب ۵۴، مسلم، کتاب الحدود، باب قطع السارق الخ

۲ ابو داؤد، کتاب الاقضية، باب فی من یعین علی خصومة من غیر ان یعلم امرها

ریاست حقوق کی نگران ہے

سماج میں کسی کا کسی حیثیت سے باختیار ہونا اسلام کے نزدیک اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرتا ہے، جس شخص کو جس حد تک بھی اقتدار حاصل ہے وہ اپنے ماتحت افراد کے حقوق کا محافظ و نگران ہے۔ اس پہلو سے سربراہ مملکت کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سن لو! تم میں سے ہر ایک راعی اور نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ وہ شخص جو لوگوں کا امام ہے وہ راعی اور نگران ہے۔ اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ آدمی اپنے گھر والوں کا نگران ہے۔ اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگران ہے۔ اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ آدمی کا غلام (خادم) اپنے سردار کے مال کا نگران ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔ ہاں! سن رکھو تم سب نگران ہو اور تم میں سے ہر ایک سے اپنی اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

الاکلکم راع، و کلکم مسئول
عن رعیتہ فالامام الذی علی
الناس راع وهو مسئول عن
رعیتہ و الرجل راع علی اهل
بیتہ وهو مسئول عن رعیتہ،
والمراة راعیة علی اهل بیت
زوجها وولده وہی مسئولة
عنہم و عبد الرجل راع علی
مال سیدہ وهو مسئول عنه الا
کلکم راع و کلکم مسئول
عن رعیتہ۔

جرم عدالت سے ثابت ہوگا

قانون کے سلسلہ میں اسلام نے یہ اصول بیان کیا کہ ہر شخص کو بے گناہ سمجھا جائے اور اسے اسی وقت مجرم گردانا جائے جب کہ عدالت سے اس کا جرم ثابت ہو جائے۔ اس کے لیے اس نے شہادت اور گواہی کا ایک پورا تفصیلی ضابطہ مقرر کیا ہے۔

۱۔ بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ اطیعوا اللہ و رسولہ الخ۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلة الامام العادل الخ

بے ثبوت کسی کو مجرم قرار دینا یا کسی کی عزت و آبرو سے کھیلنا، اس کے نزدیک قابل تعزیر جرم ہے۔ اسی ذیل میں اس نے افواہوں کو پھیلانے اور ظن و تخمین سے کام لینے سے بھی منع کیا ہے۔

روایت ہے کہ عراق سے ایک شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور کہا کہ میں ایک ایسے معاملے کی خبر دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں، جس کا سر ہے اور نہ دم (جو بے سر پیر کے ہے) حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ وہ کیا ہے؟ اس نے کہا جھوٹی گواہیاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

والله لا يؤسر رجل في الاسلام قسم خدا کی اسلام میں کوئی شخص 'عدول' (قابل بغیر عدول) اعتماد گواہوں) کے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا۔

کسی کو قید و بند کی سزا اسی وقت دی جائے گی جب کہ قابل اعتماد شہادتوں سے ثابت ہو جائے کہ واقعتاً اس نے جرم کیا ہے اور اس سزا کا مستحق ہے۔

کسی کو غلام نہیں بنایا جاسکتا

بعض اوقات انسان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ کوئی قرض ادا نہ کر سکے تو اسے فروخت کر کے قرض وصول کیا جاتا۔ یہ ایک ناروا عمل تھا۔ اسلام نے اسے ختم کیا۔ کسی کی آزادی کو سلب کرنا، اسے فروخت کرنا یا غلام کو آزاد کرنے کے بعد پھر سے اسے غلام بنا لینا اور غلاموں کی طرح اس سے خدمت لینا، یہ ساری شکلیں ممنوع ہیں۔ اس پر امت کا اجماع ہے۔ اس کی سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث قدسی روایت کی ہے:

ثلاثة انا خصمهم يوم القيامة، (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) میں قیامت کے دن تین آدمیوں کا حریف ہوں گا۔ ایک وہ شخص جس نے میرے نام سے عہد و پیمان کیا

۱. مؤطا امام مالک، کتاب الاقضية، باب ماجاء في الشهادات

پھر دھوکا دیا، دوسرا وہ جس نے کسی آزاد کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھا گیا اور تیسرا وہ جس نے کسی مزدور کو اجرت پر رکھا اور اس سے پورا کام لیا اور اس کی اجرت نہیں ادا کی۔

باع حراً فأكل ثمنه، ورجل استاجر اجيراً فاستوفى منه ولم يعط أجره۔

اسلام غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ کسی آزاد فرد کو غلام بنانا اس کے نزدیک سنگین جرم ہے۔ اسی طرح کسی سے خدمت لینا اور اجرت نہ ادا کرنا یا بیگار لینا سخت گناہ کا باعث ہے، جو شخص اس کا ارتکاب کرے اس کی نماز اور عبادت بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہوگی۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی نماز قبول نہیں کرتا۔ ان میں سے ایک ہے۔ وہ شخص جس نے اپنے آزاد کردہ غلام کو پھر سے غلام بنا لیا۔

ان غیر انسانی حرکتوں کے سدِّ باب کے لیے ریاست مناسب قانون وضع کر سکتی ہے۔

کسی کو ناحق سزا نہیں دی جاسکتی

حدیث میں آتا ہے کہ ناحق کسی کے کپڑے اتار لینا یا اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ طبرانی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جو شخص ناحق کسی مسلمان کی پیٹھ کو کپڑے اتار کر برہنہ کر دے وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر سخت غضب ناک ہوگا۔

من جرد ظهر امرئ مسلم بغير حق لقي الله وهو عليه غضبان۔

۱۔ بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حراً۔ مع فتح الباری: ۱۶۸/۵

۲۔ ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الرجل يؤم القوم وهم له کارهون۔ ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلوٰۃ، باب من ام قوما وهم له کارهون

۳۔ قال المناوی، اسنادہ جید، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۴/۲۱۲

حدیث میں اسلامی معاشرے سے خطاب ہے، اس لیے مسلمان کا ذکر ہے۔ یہی حکم غیر مسلم اور ذمی کا بھی ہے۔ اسلام کی رو سے ناحق کسی بھی فرد کو کسی قسم کی سزا دینا سنگین جرم اور خدا کے غضب کو بھڑکانے والا عمل ہے۔ سزا کے لیے جرم کا ثابت ہونا ضروری ہے، جس درجہ کا جرم ہے اسی درجہ کی سزا ہوگی۔

عزت و آبرو کا حق

انسان کے اندر خود داری اور عزت نفس کا فطری جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس کا یہ حق ہے کہ اس کی تحقیر و تذلیل نہ ہو، اس کو بدنام اور رسوا نہ کیا جائے اور معاشرہ میں اس کا احترام ہو اور اسے عزت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اسلام نے اسے اخلاقی اور قانونی حیثیت دی ہے۔ اسلام کے نزدیک کسی شریف اور مہذب انسان کی عزت و آبرو سے کھیلنا سنگین جرم ہے۔ رسول خدا ﷺ نے پاک دامن اور سیدھی سادی عورت پر بدکاری کے جھوٹے اور بے ثبوت الزام کو 'کبائر' (بڑے گناہ) میں شمار فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے 'کبائر' کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

... وَقَذَفَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ ... اور پاک دامن، بھولی بھالی مومن
المؤمنات! عورتوں پر تہمت لگانا۔

قرآن مجید نے اس شنیع حرکت پر اسی کوڑوں کی سزا رکھی ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمْنِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (النور: ۴)

جو لوگ پاک دامن اور شریف عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ پیش کریں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ فاسق ہیں۔

۱۔ بخاری، کتاب الوصایا، باب قول الله تعالى ان الذين ياكلون اموال اليتيمى ظلما۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الكبائر و اکبرها

آیت میں پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت کا حکم بیان ہوا ہے۔ یہی حکم شریف اور بااخلاق مرد کا ہے۔ اگر اس پر زنا کی تہمت لگائی جائے اور اس کا ثبوت نہ فراہم کیا جائے تو اس کی بھی یہی سزا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تہمت لگانے والا مرد ہے یا عورت، بشرطیکہ وہ عاقل و بالغ ہو۔

زنا کی تہمت کے بارے میں یہ صریح حکم ہے۔ زنا کے علاوہ کوئی اور تہمت لگائی جائے جیسے فاسق و فاجر کہا جائے یا چور اور شرابی قرار دیا جائے تو اس پر یہ حد تو جاری نہیں ہوگی، البتہ اس کی تعزیر ہوگی۔ تعزیر میں کوڑوں کے ساتھ وقت ضرورت سزائے قید بھی دی جاسکتی ہے۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ 'تعزیر' شریعت کی قائم کردہ 'حد' سے کم ہونی چاہیے۔ یہ کتنی ہو، اس میں اختلاف ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

اللہ کے حدود میں سے کسی حد کے علاوہ کسی دوسرے جرم میں دس کوڑوں سے زیادہ مارے نہیں جائیں گے۔

لا یجلد فوق عشر جلدات الا فی حد من حدود اللہ

بعض دوسرے دلائل کی بنیاد پر امام ابوحنیفہؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ غلام کے لیے حد قذف چالیس کوڑے ہیں۔ اس سے کم کے معنی یہ ہیں کہ تعزیر میں انتالیس کوڑے تک لگائے جاسکتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ غلام کی نہیں آزاد کی حد دیکھی جائے گی۔ آزاد شخص کے لیے حد قذف اسی کوڑے ہے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب کوڑے لگائے جاتے تو وہ کچھتر (۷۵) تک شمار کرتے پھر چھوڑ دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعزیر کچھتر (۷۵) کوڑوں تک ہو سکتی ہے۔

کم سے کم کے بارے میں خیال یہ ہے کہ یہ تین کوڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسی صورت بھی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ تعزیر یا سزا ہی نہ محسوس ہو، ورنہ اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ ایک رائے یہ ہے کہ کمی بیشی کا تعلق قاذف (تہمت لگانے والا)

۱۔ بخاری، کتاب الحدود، باب کم التعزیر والادب۔ مسلم، کتاب الحدود، باب قدر اسواط التعزیر

مقذوف (جس پر تہمت لگائی جائے) اور قذف کی نوعیت سے ہے۔ امام ان سب باتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے گا۔

قذف اور تہمت کا تعلق مقذوف کی عزت و آبرو سے ہے۔ اگر وہ قاذف کو معاف کر دے تو کیا حد ساقط ہو جائے گی؟ امام ابو حنیفہؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اس میں معاف کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سے حد ساقط نہیں ہوگی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ معاف کرنا جائز ہے۔ اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔ ایک رائے یہ ہے کہ مقدمہ امام (عدالت) تک پہنچ جائے تو معافی نہیں ہوگی۔ اس سے پہلے ہو سکتی ہے۔

اسلام نے عزت و آبرو کو انسان کا بنیادی حق ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کی حفاظت کے لیے مفصل قانون بھی دیا ہے۔

سفر کا حق

اسلام نے انسان کا یہ حق قرار دیا ہے کہ وہ اپنی دینی اور دنیوی ضروریات کی تکمیل کے لیے زمین میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرے۔ اس نے زمین میں چل پھر کر عجائبات قدرت کو دیکھنے اور مطالعہ کرنے کی ترغیب دی ہے اور آثار تاریخ کے مشاہدہ اور اس سے عبرت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی طرح انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی اس نے سفر کی اجازت دی ہے۔ اس نے بار بار اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر کیا ہے کہ اس نے زمین کی ساخت ایسی رکھی ہے کہ انسان اپنے مقاصد کے لیے اس پر آسانی سے سفر کر سکتا ہے۔ ارشاد ہے:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا اللَّهُ وَهِيَ جَسَدٌ لِّمَنَ يُرِيدُ
وَجَعَلَ لَكُمُ فِيهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ فَرَّشَ بَنَادِيَا وَرَمَحَ لَهَا
تَهْتَدُونَ ۝ (الزخرف: ۱۰) نکال دیے تاکہ تم منزل تک پہنچ سکو۔

۱۔ ہدایہ، کتاب الحدود، باب حد القذف

۲۔ ابن رشد، بدایۃ المجتہد: ۶/۱۴۰، طبع بیروت ۱۹۹۶ء

ایک اور جگہ فرمایا:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بِسَاطًا ۝
لَتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (نوح: ۲۰، ۱۹)

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو
فرش بنا دیا ہے تاکہ تم اس کے وسیع
راستوں میں چلو۔

اسلام نے حالت سفر میں بعض فرائض و واجبات میں رعایتیں دی ہیں۔
معاشرہ کی ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ مسافروں کی مدد کرے اور انہیں سہولتیں فراہم
کرے۔ بیت المال میں ان کا حق رکھا ہے اور جو لوگ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے تلاش
معاشرہ کے لیے سفر نہیں کر سکتے، ان کے ساتھ ہمدردی کا حکم دیا ہے۔ یہ بھی اس بات کی
دلیل ہے کہ انسان حسب ضرورت دینی اور دنیوی مقاصد کے لیے سفر کر سکتا ہے۔ اسلام
اسے جائز قرار دیتا ہے اور اس میں مدد کرتا ہے۔ بعض حالات میں سفر اس کے نزدیک
پسندیدہ عمل بھی ہے۔ اس میں غیر ضروری پابندیوں کا وہ قائل نہیں ہے۔

مظلوم کا حق

اسلام نے انسان کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ وہ خوف و خطر سے پاک اور امن و
امان کی زندگی گزارے۔ اس کی جان مال اور عزت و آبرو کو کوئی خطرہ نہ لاحق ہو۔ اس پر
دست درازی ہو تو اسے اس کے خلاف آواز اٹھانے کا حق حاصل رہے۔ وہ عدالت سے
رجوع کر سکے اور عوام کے سامنے بھی اپنا مقدمہ پیش کرنے کی اسے اجازت ہو۔ قرآن
پاک میں ارشاد ہے:

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوِّءِ مِنَ
الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلِمَ (النساء: ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے اظہار و اعلان کو
پسند نہیں کرتا البتہ جس پر ظلم ہوا ہے (اسے
اس کا حق ہے)

ایک طرف مظلوم کا یہ قانونی اور اخلاقی حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ ظلم کے خلاف
آواز اٹھائے اور انصاف کا مطالبہ کرے، دوسری طرف معاشرہ کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی
ہے کہ وہ آگے بڑھے اور مظلوم کی مدد کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے مظلوم کی مدد کو اس کا

لازمی حق بتایا ہے اور یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ ظالم کی کسی پہلو سے تائید نہ ہو۔ ظلم کی حمایت روح اسلام کے منافی ہے۔ ارشاد ہے:

من مشی مع ظالم ليقويه وهو
يعلم انه ظالم فقد خرج من
الاسلام^۱
جو شخص کسی ظالم کے ساتھ یہ جانتے ہوئے
کہ وہ ظالم ہے، اسے تقویت پہنچانے کے
لیے چلے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

عدل و انصاف کے قیام کے لیے معاشرہ میں مظلوم کے ساتھ تعاون اور ظالم سے عدم تعاون کی فضا کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن اس میں ریاست کے کردار کی بڑی اہمیت ہے۔

اسلامی ریاست مظلوم کو اس کا حق دلانے کی پابند ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے خلافت کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں حکومت کی پالیسی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

الضعيف فيكم قوي عندى ۱
حتى اخذ له حقه والقوى
ضعيف عندى حتى اخذ منه
الحق ان شاء الله تعالى^۲
تم میں جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی
ہوگا۔ یہاں تک کہ میں اس کا حق لے کر
اسے پہنچا دوں اور جو تم میں قوی ہے وہ
میرے نزدیک ضعیف ہوگا یہاں تک کہ اس
کے پاس دوسرے کا جو حق ہے وہ اس سے
میں لے لوں۔ ان شاء اللہ

جب مظلوم کی پشت پر حکومت کی طاقت ہو اور وہ عدل و انصاف کے قیام کو اپنی بنیادی ذمہ داری قرار دے تو کم زور سے کم زور فرد کا بھی کوئی حق ضائع نہیں ہو سکتا۔

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الظلم بحوالہ بیہقی شعب الایمان

۲۔ ابن اثیر، الكامل فی التاریخ: ۲/۱۹۴-۱۹۵

بنیادی ضروریات کی تکمیل کا حق

انسان کی بنیادی ضروریات

انسانی جان کے احترام کے تصور کے ساتھ اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا تصور وابستہ ہے۔ اسلام ہر انسان کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے سعی و جہد کرے۔ اس کے لیے وہ خدا کی پوری زمین اور اس کے وسائل کو استعمال کر سکتا ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور خادم جیسی ضروریات شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اسلام نے واضح موقف اختیار کیا ہے۔ وہ ان میں سے کسی کے حصول کا مخالف نہیں بلکہ اس کی اس نے ترغیب دی ہے۔

معاشی جدوجہد

اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ اس زمین میں انسان کے رزق کا بھرپور سامان رکھا ہے۔ اس پر بسنے والے ہر فرد کا یہ فطری حق ہے کہ اسے حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کی سعی و جہد کرے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ
ذُلُولًا فَأَمْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَ
كُلُوا مِنْ رِزْقِهِ ۚ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ۝
(الملک: ۱۵)

وہی خدا ہے جس نے زمین کو تمہارے
تابع کر دیا کہ اس کے کناروں پر چلو اس
کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور اسی کی طرف اٹھ
کر جانا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو
مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں
اس میں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل
(رزق) تلاش کرو اور شاید کہ تم اس کا شکر
ادا کرو۔ اس نے تمہارے لیے وہ سب
چیزیں اپنی طرف سے مسخر کر دیں جو آسمانوں
میں اور جو زمین میں ہیں۔ بے شک
اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں
ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ
لِتَجْرِيَ الْفُلُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَ
لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ ۝ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي
السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا
مِّنْهُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ ۝ (الجاثیہ: ۱۲، ۱۳)

نماز جمعہ کی اہمیت اور اس میں شرکت کو لازمی قرار دینے کے بعد فرمایا:

جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل
جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو اور اللہ کو
کثرت سے یاد کرو۔ امید ہے تم فلاح
پاؤ گے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا
فِي الْأَرْضِ وَ ابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ
اللَّهِ وَ اذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ
تُفْلِحُونَ ۝ (الجمعة: ۱۰)

مطلب یہ ہے کہ نماز ختم ہونے کے بعد تمہیں اجازت ہے کہ اللہ کے فضل کی
تلاش میں زمین میں پھیل جاؤ۔ پوری زمین تمہارے لیے ہے۔ اس کے وسائل سے
فائدہ اٹھانے کا تمہیں حق ہے۔

انسان اور دوسری ذی روح مخلوقات میں ایک فرق یہ ہے کہ وہ فطرتاً صاف
ستھری اور پاکیزہ غذا چاہتا ہے۔ گندی اور ناپاک غذائیں اس کی فطرت سے میل نہیں
کھاتیں اور وہ اس کے لیے مضر صحت اور نقصان دہ بھی ہیں۔ جن غذائی اشیاء کو وہ ان کی
اصل حالت میں استعمال کرتا ہے وہ بھی صاف ستھری ہونی چاہئیں اور جن چیزوں کو وہ
سخت و پز کے ذریعہ خوش ذائقہ اور قابل ہضم بنا کر استعمال کرتا ہے انہیں بھی گندگی سے
پاک ہونا چاہیے۔

۱۔ اس سلسلہ کی مزید آیات ملاحظہ ہوں، طہ: ۵۳، ۵۴

بنیادی ضروریات

اسلام کے نزدیک انسان کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی سعی و جہد سے پاک اور صاف ستھری غذا حاصل کرے۔ یہ تقویٰ اور دین داری کے منافی نہیں ہے۔ البتہ اس سعی و جہد میں حلال و حرام کی پابندی ضروری ہے۔

اے لوگو کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے وہ ساری چیزیں جو حلال اور پاکیزہ ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اس بات کا کہ تم اللہ کے بارے میں جھوٹی باتیں کہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَ أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (البقرة: ۱۶۸، ۱۶۹)

لباس

انسان کی بنیادی ضرورتوں میں لباس بھی شامل ہے۔ انسان کے لیے لباس کی اہمیت کئی پہلوؤں سے ہے۔ یہ اسے جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ جو جانور جہاں پایا جاتا ہے اس کی جسمانی ساخت وہاں کے لیے مناسب اور موزوں ہوتی ہے۔ اگر موسم سخت ہوتا ہے تو وہ دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ انسان کا حال اس سے مختلف ہے۔ اس کا جسم موسم کی گرمی اور سختی کو برداشت نہیں کر پاتا۔ وہ لباس کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حیوان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس انسان کی فطرت میں شرم و حیا پائی جاتی ہے۔ عریانی اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ وہ جسم کے قابل ستر حصوں کو لازماً چھپانا چاہتا ہے۔ یہ فطری حیا ہی تھی کہ حضرت آدم و حوا سے جنت کا لباس چھن گیا تو وہ درخت کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپنے لگے۔

وَ طَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ (الاعراف: ۲۲) اور جوڑنے لگے اپنے اوپر جنت کے پتے۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ لباس انسان کے لیے وجہ زینت اور آرائش بھی ہے۔

يَبْنِيْ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا
يُّوَارِيْ سَوْءَ تِكُمْ وَرِيْشًا
وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ
يَذَكَّرُوْنَ ۝ (الاعراف: ۲۶)

اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا ہے،
جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور
زینت کے لباس بھی اتارے لیکن تقویٰ کا
لباس بہتر ہے۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں
ہیں شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اس طرح اسلام نے لباس اور بہتر لباس کی ضرورت اور اہمیت واضح کی ہے۔
وہ اسے انسان کی بنیادی ضرورت مانتا ہے۔ البتہ اس کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی اس
ظاہری لباس کی فکر میں لباس تقویٰ کو نہ فراموش کر بیٹھے۔

مکان

مکان بھی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ مکان مختلف نوعیت کے ہوتے

ہیں۔ ہر ایک کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ قرآن مجید نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ
سَكَنًا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ
الْاَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ
ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۝ وَ مِنْ
اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَا
اَثَاثًا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ وَاللّٰهُ
جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَ
جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا
وَ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيْكُمْ الْحَرَّ

اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھر رہنے
بننے کی جگہ بنائے اور تمہارے لیے
چوپایوں کی کھالوں سے گھر (خیمے) بنائے
کہ تم ان کو ہلکے پاتے ہو اپنے کوچ کے دن
اور اپنے ٹھہرنے کے دن۔ اس نے چوپایوں
کی اون سے روؤں سے اور بالوں سے
ایک مدت خاص تک کے لیے ساز و سامان
اور اسباب حیات بنائے۔ اللہ نے تمہارے
لیے اپنی بنائی ہوئی چیزوں میں سائے رکھے
اور تمہارے لیے پہاڑوں میں روپوش ہونے
کے مقامات رکھے اور اس نے تمہارے
لیے لباس بنائے جو تمہیں گرمی سے

وَسَرَابِيلٌ تَقِيكُمُ بَاسَكُمْ ۝
كَذَلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ
لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ ۝ (النحل: ۸۰-۸۱)

بچاتے ہیں اور ایسے لباس (زرہیں) بھی
بنائے جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتے
ہیں۔ اس طرح اللہ اپنی نعمت تم پر پوری کرتا
ہے تاکہ تم اس کے فرماں بردار بنو۔

ان آیات میں تین طرح کے مکانات کا ذکر ہے۔

۱- وہ ٹھکانے جو انسان پہاڑوں اور جنگلوں میں بناتا ہے، انسان نے تاریخ
کے ابتدائی دور میں ممکن ہے اسے عام طور پر استعمال کیا ہو لیکن اب وہ زیادہ تر انہیں اپنی
جنگی ضروریات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وقتی اور ہنگامی طور پر غیر جنگی مقاصد کے لیے
بھی ان کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

۲- دوسرے مکانات وہ ہیں جو خیموں اور چھول داریوں کی شکل میں بنائے
جاتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی منتقل ہو سکتے ہیں۔ جنہیں خانہ بدوش
استعمال کرتے ہیں۔ تفریحات یا فوجی ضرورت کے لیے بھی ان کا استعمال ہو سکتا ہے۔

۳- مکانات کی تیسری قسم وہ ہے جن کے بارے میں قرآن نے 'سکنا' کا لفظ
استعمال کیا ہے جن میں انسان مستقل رہائش اختیار کرتا ہے، جن سے اس کی رہائشی
ضروریات پوری ہوتی ہیں اور جن میں وہ سکون اور راحت محسوس کرتا ہے۔ یہ تمدنی زندگی
کا ایک لازمی جزء بھی ہے۔

ان مختلف قسم کے مکانات اور عام پوشاک اور جنگی لباس کے متعلق ان آیات
میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ دوسری یہ
کہ ان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل و احسان کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی
کے پاس مکان ہے تو اللہ کی ایک نعمت اسے حاصل ہے۔ اس پر اسے اللہ کا شکر ادا کرنا
چاہیے۔ اگر کسی کے پاس مکان نہیں ہے تو اس کے لیے اس کا کوشش کرنا غلط نہ ہوگا بلکہ
ایک پسندیدہ عمل قرار پائے گا اس لیے کہ وہ ایک اللہ کی نعمت تلاش کرتا ہے اور اس لیے
تلاش کرتا ہے تاکہ وہ اس معاملہ میں دوسروں کا محتاج نہ رہے۔

مکان ایک ضرورت ہے۔ اسلامی ریاست اپنے کارکنوں کی یہ ضرورت پوری کرے گی بلکہ اس کی کوشش ہوگی کہ ریاست کے سب ہی شہریوں کو اس کی سہولت حاصل ہو۔ اس میں وہ ممکنہ تعاون کرے گی۔ جن کے پاس مکان ہے اس پر ان کا حق ملکیت تسلیم کرے گی اور اس کی حفاظت کرے گی۔

خادم اور سواری

اسلام اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سواری اور خادم بھی انسان کی ضرورت ہے اور وہ اسے حاصل ہونی چاہیے۔ مستورد بن شدادؓ کہتے ہیں میں نے نبی ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے۔

من كان لنا عاملا فليكتسب
زوجة فان لم يكن له خادم
فليكتسب خادما فان لم يكن له
مسكن فليكتسب مسكنا و في
رواية من اتخذ غير ذلك فهو
غال

جو ہمارا عامل (کارندہ) ہے وہ بے شادی
شدہ ہے تو (بیت المال سے مدد لے کر)
شادی کر لے، اگر اس کے پاس خادم نہیں
ہے تو خادم حاصل کر لے، اگر اس کا مکان
نہیں ہے تو مکان بنا لے۔ ایک روایت میں
یہ بھی ہے کہ جو شخص ان کے علاوہ کچھ اور
بیت المال سے حاصل کرے گا وہ خائن ہوگا

حدیث میں ریاست کے ملازم کو اپنی حقیقی ضروریات پورا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ اجازت کچھ حدود و قیود کے ساتھ ہوگی اور اس کا تعلق ریاست کی مالی حالت سے بھی ہوگا۔ اگر کسی کی تنخواہ ہی اس کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی ہے تو وہ ریاست کے خزانے سے مزید فائدہ اٹھانے کا مجاز نہ ہوگا۔

معاشی خوش حالی

اسلام معاشی خوش حالی کو غلط نہیں سمجھتا بلکہ اس کا وعدہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ

۱۔ ابو داؤد، کتاب الخراج و الفی و الامارۃ، باب فی ارزاق العمال

کے احکام کا پابند رہے اور اس کے ہاتھوں اللہ کے دین کی اقامت ہو جائے تو اسے معاشی خوش حالی ملے گی۔ ارشاد ہے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ
وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكْلُوا
مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ
مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَ كَثِيرٌ مِنْهُمْ
سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ○ (المائدة: ۶۶)

اگر وہ (اہل کتاب) قائم کرتے تو ریت اور
انجیل کو اور اس (قرآن) کو جو ان کے رب
کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا ہے تو اپنے
اوپر (آسمان) سے بھی کھاتے اور اپنے
پیروں کے نیچے (زمین کے اندر) سے بھی۔
ان میں سے کچھ تو راہِ اعتدال پر قائم ہیں۔
لیکن ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو برے کام
کر رہے ہیں۔

مال کی اہمیت کو اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اسے تسلیم کیا ہے اور اسے
زندگی کے قیام و بقا کا ذریعہ کہا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَوُتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي
جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَمًا (النساء: ۵)

اپنے اموال، جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے
قیامِ حیات کا ذریعہ بنایا ہے، نادانوں کے
حوالہ مت کرو۔

مال آدمی کے پاس ہو اور وہ اسے نیکی کی راہ میں خرچ کرے تو وہ قابلِ رشک
ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

لا حسد إلا في اثنين رجل
اتاه الله مالا فسلطه على هلكته
في الحق و رجل اتاه الله
الحكمة فهو يقضي بها و
يعلمها

حسد (رشک) تو بس دو آدمیوں پر ہے۔
ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا اور اس
نے اپنے مال کو راہِ حق میں لٹانے پر لگا
دیا۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت (فہم
دین) سے نوازا۔ وہ اس کے ذریعے فیصلہ
کرتا ہے اور اس کی دوسروں کو تعلیم دیتا ہے

۱۔ بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحكمة۔ مسلم کتاب صلوٰۃ
المسافرین، باب فضل من يقوم بالقرآن و يعلمه

حضرت سعدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الله يحب العبد التقي الغني
بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اس بندہ
سے جو صاحب تقویٰ ہے، غنی اور تو نگر ہے
الخفی!

اور پوشیدہ رہتا ہے۔

مطلب یہ کہ وہ غنی جو خاموشی سے اپنی دولت صرف کرتا ہے۔ اس کا اظہار اور

نام و نمود نہیں چاہتا بلکہ اپنے آپ کو پس پردہ رکھتا ہے، اللہ کو بہت محبوب ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

نعم المال الصالح للرجل الصالح
مال صالح اچھا ہے مرد صالح کے لیے۔

مال جائز طریقہ سے حاصل ہو اور وہ نیک ہاتھوں میں ہو تو یہ ناپسندیدہ نہیں بلکہ

پسندیدہ چیز ہے۔ یہ اللہ کے دین اور اس کے بندوں کی خدمت کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جائز حدود میں کسب مال کی کوشش غلط نہیں ہے۔ اسلام

اس کے مواقع اور سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

حکومت کی ذمہ داری

اسلامی ریاست رفاہی ریاست ہے، جو شخص بھی اپنی بنیادی ضروریات پوری نہ

کر سکے اسلامی ریاست ان کی تکمیل کرے گی۔ وہ ہر اس فرد کی کفالت کی ذمہ دار ہے جو

نادار ہے اور اپنا معاشی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ رسول خدا ﷺ نے معاشی

کفالت کا جو اعلان فرمایا اس کا ذکر حضرت ابو ہریرہؓ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ حضرت

ابو ہریرہؓ کی روایت ہے:

فلما فتح الله عليه الفتوح قال
جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات کا دروازہ آپ پر

انا اولی بالمؤمنین من انفسهم
کھول دیا تو آپ نے اعلان فرمایا: میں مومنین

۱۔ مسلم، کتاب الزہد والرقائق

۲۔ مسند احمد: ۱۹۳/۴ و رواہ البغوی فی شرح السنة کما فی المشکوۃ

بنیادی ضروریات

فمن مات و علیہ دین ولم
یتروک وفاءً فعلی قضاؤہ، ومن
ترک مالا فلورثتہ، و فی روایۃ
من ترک دینا اوضیاعا فلیناتنی
فانا مولاه و فی روایۃ من ترک
مالا فلورثتہ، ومن ترک کلا
فالناب۔

کی جانوں سے زیادہ ان سے قریب ہوں، جس
کسی کا انتقال ہو جائے، اس پر قرض ہو اور وہ
اس کی ادائیگی کے لیے کوئی چیز نہ چھوڑے تو اس
کا ادا کرنا میرے ذمہ ہوگا اور کوئی مال چھوڑ کر
جائے تو وہ اس کے ورثاء کا ہوگا، ایک روایت
میں ہے جو شخص قرض یا اہل و عیال جن کے
ہلاک ہونے کا خطرہ ہو، چھوڑ کر جائے، وہ
میرے پاس آئیں، میں ان کا والی اور سرپرست
ہوں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جو مال چھوڑ
کر دنیا سے جائے تو وہ اس کے ورثاء کا ہوگا اور
جو کوئی بوجھ (قرض یا مفلس اہل و عیال) چھوڑ
کر جائے تو وہ ہمارے ذمہ ہوگا۔

مدینہ کے ابتدائی دور میں رسول خدا ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی کا انتقال
ہوتا تو آپ دریافت فرماتے کہ کیا اس پر کھئی قرض ہے اور ہے تو کیا اس نے اتنا مال
چھوڑا ہے کہ اس سے قرض ادا ہو سکے؟ اگر بتایا جاتا کہ اس کے مال سے قرض کی ادائیگی
ہو سکتی ہے تو آپ اس کی نماز جنازہ پڑھتے ورنہ فرمادیتے کہ جاؤ تم لوگ نماز پڑھ لو۔
(یہ تہدید تھی کہ لوگ قرض کے معاملہ میں بے احتیاطی سے کام نہ لیں اور
مرنے سے پہلے اس کا انتظام کریں) البتہ کبھی کوئی شخص میت کی طرف سے قرض کی
ادائیگی کا ذمہ لے لیتا تو آپ اس کی نماز جنازہ پڑھتے تھے۔^۱ لیکن بعد کے دور میں
آپ نے یہ ذمہ داری خود لے لی۔

فلما فتح اللہ علیہ الفتوح (جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات کا سلسلہ آپ کے
لیے شروع کر دیا) کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ریاست پر ناداروں کی کفالت یا مستحق اور
مفلس قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری اس وقت عائد ہوگی جب کہ وہ اس

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الفرائض، بحوالہ بخاری و مسلم۔

نیز ملاحظہ ہو باب الافلاس والانظار

۲۔ بخاری، کتاب الکفالة، باب الدین

موقف میں ہو۔ اس موقف میں ہوتے ہوئے اپنی اس ذمہ داری کو اپنے وسائل کے لحاظ سے پوری طرح یا حسب استطاعت وہ ادا نہ کرے تو اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرے گی اور گناہ گار ٹھہرے گی۔^۱

دنیا مقصود نہ بن جائے

اسلام نے جائز ذرائع سے معاشی ترقی پر پابندی عائد نہیں کی ہے۔ اس معاملہ میں فرد کو ریاست کا تعاون حاصل ہوگا۔ معاشی لحاظ سے کم زور اور نادار افراد اور طبقات کی وہ مدد کرے گی۔ اس کے ساتھ اسلام اس بات کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے کہ دنیا کی زندگی مقصود نہ بن جائے۔ اس کی ہوس اور اس کے حصول کی تڑپ میں انسان خدا کی یاد سے غافل نہ ہو جائے۔

اے ایمان والو! تمہارے اموال اور
تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل
نہ کر دے۔ جو ایسا کریں وہی نقصان
اٹھانے والے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ
أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ
اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْخَسِرُونَ ۝ (المنفقون: ۹)

انسان بندہ دنیا بن جائے اور مال و دولت سمیٹنے میں لگ جائے تو آخرت اس کی نگاہ سے اوجھل ہونے لگتی ہے۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ اس لیے قناعت کی تعلیم اور ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کا دائرہ محدود رکھے اور اسے زیادہ وسعت نہ دے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لیس لابن آدم حق فی سوی
ہذہ الخصال، بیت یسکنہ و
ثوب یواری بہ عورتہ وجلف
الخبز والماء^۲

ابن آدم کا (اس دنیا میں) کوئی حق نہیں
ہے سوائے ان چیزوں کے۔ گھر جس میں
وہ رہے، کپڑا جس سے وہ قابل ستر مقامات
کو چھپا سکے اور سوکھی روٹی اور پانی۔

۱۔ ابن حجر، فتح الباری: ۲۴۵/۵ دار الفکر، بیروت ۱۹۹۳ء

۲۔ ترمذی، کتاب الزہد، باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا

بنیادی ضروریات

حضرت بریدہ سلمیٰؓ کی روایت میں اوپر کی بیان کردہ ضروریات زندگی میں بعض اور ضروریات کا اضافہ ہے لیکن ساتھ ہی قناعت کی تعلیم ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یکفی احدکم من الدنيا خادم و تم میں سے کسی بھی شخص کے لیے اس دنیا مرکبہ سے ایک خادم اور سواری کافی ہے۔

ابو ہاشم بن عتبہؓ نے زندگی کے آخری لمحات میں افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ تمہارے سامنے اموال تقسیم ہوں گے۔ تمہارے لیے ان میں سے ایک خادم اور ایک سواری جو اللہ کی راہ میں جہاد کے کام آئے کافی ہے میں نے وہ زمانہ پایا اور بہت سا مال جمع کیا۔ کاش میں اس عہد پر قائم رہتا جو آپ سے کیا تھا۔

انسان اپنی مادی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسلام ان کی تکمیل کے لیے جائز حدود میں جدوجہد کو صحیح سمجھتا ہے۔ اور ریاست کو اس میں تعاون کی ہدایت بھی کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ انسان بندہ دنیا بن کر رہ جائے اور آخرت کو فراموش کر دے۔

۱۔ مسند احمد: ۵/۶۰۔ ترمذی ابواب الزہد، باب ماجاء فی الهم فی الدنيا وحبها

۲۔ ترمذی، ابواب الزہد... ابن ماجہ، کتاب الرقاق، باب الزہد فی الدنيا

سماجی و معاشرتی حقوق

سماجی و معاشرتی حقوق

انسان جس معاشرے میں رہتا بستا ہے اس میں بے جان زندگی گزارنا نہیں بلکہ موثر اور فعال کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس کا فطری حق ہے اور معاشرہ بھی اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب کہ ہر فرد کو اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تنگ و دو کے مواقع حاصل ہوں اور وہ بعض متعین حقوق و اختیارات رکھتا ہو۔ دنیا کے تمام جمہوری قوانین میں Personal liberty (شخصی آزادی) انسان کا ایک بنیادی حق ہے لیکن کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اس حق کے ذریعہ وہ دوسرے کی آزادی پر شب خون مارے اور اسے سلب کر لے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ There can not be freedom to destroy freedom۔ (آزادی، آزادی کو تباہ کرنے کے لیے نہیں ہو سکتی) اسی طرح قومی اور ملکی مفاد، شخصی مفاد پر مقدم ہے۔ کوئی فرد یہ حق نہیں رکھتا اور نہ اسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ آزادی سے فائدہ اٹھا کر ملک و قوم کو نقصان پہنچائے۔ شخصی آزادی کے مختلف پہلو ہیں۔ اسلام نے ان سب کے احترام کی تعلیم دی ہے اور ان کے حدود متعین کیے ہیں۔

فکر کی آزادی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و خرد عطا کی ہے۔ اس کا ایک امتیازی وصف یہی

ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام اس صلاحیت کی نشوونما اور ترقی چاہتا ہے اور اسے دبانے اور کچلنے کی ہر کوشش کے خلاف ہے۔ اس نے انسان کو اوہام و خرافات سے نکالا، غور و فکر اور تدبیر و تفکر پر ابھارا اور اس کی ترغیب دی ہے۔ اس کے نزدیک کسی معاملے میں غیر عقلی رویہ اختیار کرنا اور بے دلیل کسی بات پر اصرار کرنا انسانی عظمت کے منافی ہے۔ اس نے تقلید اعمیٰ اور بے سوچے سمجھے آباء و اجداد کے طریقوں کی پابندی اور روایت پرستی پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قوموں کا یہ قدیم مرض ہے۔ اسی وجہ سے وہ تباہ ہوتی رہی ہیں۔

کیا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے جسے انھوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہو، بلکہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم ان ہی کے نقش قدم سے راہ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے آسودہ حال لوگوں نے (یہی) کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ پیغمبر نے کہا کہ اگر تمھارے سامنے اس سے زیادہ ہدایت اور راہ نمائی کا طریقہ پیش کروں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (تو کیا تب بھی اسے قبول نہ کرو گے) انھوں نے جواب دیا کہ جو دین تم لائے ہو ہم اس کے ماننے والے نہیں ہیں۔ پھر ہم نے ان سے انتقام لیا۔ پس دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

أَمْ اتَيْنَهُمْ كِتَابًا مِّنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ
مُتَمَسِّكُونَ ۝ بَلْ قَالُوا إِنَّا
وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا
عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّهْتَدُونَ ۝ وَ
كَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ
فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ
مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ
أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ۝
قُلْ أَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِأَهْدَىٰ مِمَّا
وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قَالُوا إِنَّا
بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ فَانْتَقَمْنَا
مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِينَ ۝ (الزخرف: ۲۱-۲۵)

اسلام ہر بات کو دلائل سے سمجھنے کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ اسے اپنے مخالفین سے شکایت ہے کہ وہ فہم و دانش سے کام نہیں لیتے اور اس کے دلائل پر غور نہیں کرتے:

ہم نے جن و انس میں سے بہت سوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سوچتے سمجھتے نہیں ہیں، ان کے آنکھیں ہیں لیکن ان سے وہ دیکھتے نہیں ہیں، ان کے کان ہیں لیکن وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چو پاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنَّهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أُذُنٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (الاعراف: ۱۷۹)

اسلام نے غور و فکر پر زور دینے کے ساتھ انسانی عقل کی محدودیت بھی واضح کی ہے اور غور و فکر کے لیے صحیح بنیادیں فراہم کی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ عقل کا اس طرح استعمال ہو کہ آدمی راہ ہدایت پاسکے۔

عمل کی آزادی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور نہیں پیدا کیا ہے بلکہ حرکت و عمل کی آزادی دی ہے، وہ اپنی آزاد مرضی سے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے لیکن اس آزادی کا بے قید استعمال تباہ کن ہے۔ اس لیے اس پر کسی نہ کسی نوع کی پابندی ضروری ہے۔ اسلام نے انسان کو آزادی عمل کا حق دیا ہے لیکن وہ اسے کسی ایسے اقدام کی اجازت نہیں دیتا جو معاشرے کے لیے ضرر رساں اور فساد فی الارض کا موجب ہو۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر جو اس دنیا میں آتے رہے ہیں، ان کا ایک خاص ہدف یہ بھی رہا ہے کہ اللہ کی زمین سے فساد اور بگاڑ کا خاتمہ ہو اور نوع انسانی کو امن و سکون کی زندگی میسر آئے۔

قوم مدین میں حضرت شعیب کی بعثت ہوئی تھی۔ وہ دعوت توحید کے ساتھ اس بات کی ہدایت کرتے ہیں کہ وہ خدا کی زمین پر فساد کی روش سے باز آجائے۔ فرماتے ہیں:

يَقُومُوا عِبَادُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَ تَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۚ

اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے اور

ناپ تول پورا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے مت دو اور زمین میں (اللہ کے نیک بندوں کے ذریعے) اس کی اصلاحات کے بعد فساد نہ پھیلاؤ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اور راستوں پر اس لیے نہ بیٹھو کہ لوگوں کو ڈراؤ اور دھمکاؤ اور جو ایمان لائے اس کو اللہ کے دین سے روکو اور اس میں خامی ڈھونڈو۔ یاد کرو جب تم تھوڑے تھے اللہ نے تمہاری آبادی میں اضافہ کیا اور غور کرو کہ فساد کرنے والوں کا (اس سے پہلے) کیا انجام ہوا۔

رَبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَأَذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۚ وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝

(الاعراف: ۸۵-۸۶)

قوم شمود بڑی خوش حال اور تمدنی لحاظ سے اپنے وقت کی ایک 'ترقی یافتہ' قوم تھی، لیکن اس کے لیڈروں نے فساد فی الارض کا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ حضرت صالح نے اس گم راہ قیادت کے خلاف آواز اٹھائی اور قوم کو دعوت دی:

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (الشعراء: ۱۵۱-۱۵۲) اور حد سے بڑھ جانے والوں کی اطاعت نہ کرو، جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

مدینے کی اسلامی ریاست خیر و صلاح اور عدل و انصاف کا مرکز اور دنیا کے لیے اعلیٰ ترین نمونہ تھی، لیکن منافقین اسے اپنی مفسدانہ حرکتوں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرآن مجید نے اسے متعدد مواقع پر بے نقاب کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (البقرة: ۱۱-۱۲) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو بس اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار رہو کہ یہی فساد کرنے والے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

سعی و جہد اور حرکت و عمل انسان کا فطری حق ہے۔ اسلام اس پر قدغن عائد نہیں کرتا البتہ وہ ان کوششوں کے خلاف ہے جو معاشرہ کو فساد اور بگاڑ کی طرف لے جاتی ہیں اور بالآخر اسے تباہی اور بربادی سے ہم کنار کرتی ہیں۔

اظہار خیال کی آزادی

آج کی جمہوری دنیا میں اظہار خیال کی آزادی کو انسان کا ایک بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔ دوسروں کو اسے قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار ہے۔ لیکن اس حق کا بے قید استعمال معاشرے کے لیے سخت نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے، اس لیے اس پر بعض پابندیاں بھی لگائی جاتی ہیں۔

اسلام کے نزدیک انسان کا یہ فطری حق ہے کہ اس کی زبان بندی نہ ہو، اسے اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت ہو اور وہ انھیں دوسروں کے سامنے پیش کر سکے۔ لیکن اس نے اسے بعض حدود کا پابند بھی بنایا ہے۔ یہ حدود ایسے ہیں کہ فرد اور سماج کے لیے ان کی معقولیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے جو حدود عائد کیے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ اظہار خیال میں آدمی اخلاقی حدود کا پابند ہو، دوسروں کی عزت نفس کا احترام کرے، اسے رسوا اور بدنام کرنے اور اس کی عزت و آبرو سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے۔ کذب بیانی، افترا پردازی، طنز و تعریض، دشنام طرازی، بد زبانی اور بد گوئی جیسی اخلاقی خرابیوں سے اجتناب کرے۔ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُوا قَوْمًا
مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا
مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءً مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ
أَنَّ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ لَا يَدْرُونَ شَيْءًا

اے ایمان والو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق
نہ اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں
اور عورتیں (بھی) دوسری عورتوں کا مذاق نہ

اڑائیں، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو اور برے القاب سے نہ پکارو۔ ایمان کے بعد فسق کا نام لگنا برا ہے۔ جو لوگ (ان حرکتوں سے) توبہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان سے بچو۔ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ تم اس سے گھن کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

أَنْ يَكُنْ خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ط
بُئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝ (الحجرات: ۱۱-۱۲)

یہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا ایک نمونہ ہے۔ اس سلسلے کی اور اخلاقی تعلیمات قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ انھیں حسب ضرورت قانونی شکل بھی دی جاسکتی ہے اور ان کے حدود متعین کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ اظہار خیال کے نام پر بے حیائی اور بدکاری کے نشر و اشاعت کی اجازت نہ ہوگی۔ جو سوسائٹی اخلاق اور تہذیب و شرافت کی علم بردار ہو وہ کسی حال میں اخلاق باختگی کی تعلیم و تبلیغ کے لیے جواز نہیں فراہم کر سکتی۔ اس طرح کی ہر کوشش کو وہ سختی سے روک دے گی۔

بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان کے درمیان بدکاری کا چرچا ہو تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں درد ناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (النور: ۱۹)

۳- ریاست میں بے چینی اور اضطراب پیدا کرنے، بد امنی پھیلانے اور ملکی مفاد کو خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہ ہوگی۔

منافقین اور یہود اسلامی ریاست کے خلاف ہر وقت سرگرم رہتے تھے۔ ان کا ایک خاص مشغلہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے درمیان غلط افواہیں پھیلائیں اور حالت جنگ میں ان کی ناکامی کی پیش گوئی کرتے رہیں اور کسی وقتی اور ہنگامی نقصان کا اس طرح چرچا کریں جیسے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے، تاکہ مسلمانوں کی ہمت پست ہوا اور وہ اپنا عزم و حوصلہ کھو بیٹھیں۔ اس کا تعلق ریاست کی سلامتی سے تھا اس لیے ان کے خلاف سخت قدم اٹھانے کی ہدایت کی گئی۔

اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹی خبریں پھیلانے والے (اپنی حرکتوں سے) باز نہ آئے تو ہم ضرور آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے اور پھر وہ مدینہ میں آپ کے قریب چند دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکیں گے۔ لعنت ہے ان پر، وہ جہاں کہیں پائے جائیں پکڑے جائیں اور بری طرح مارے جائیں۔ یہی اللہ کا طریقہ رہا ہے ان لوگوں میں جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تم اس طریقہ میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۚ مَلْعُونِينَ ۖ اَيْنَمَا تُقِفُوا اُخِذُوا وَ قُتِلُوا تَقْتِيلًا ۝ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝ (الاحزاب: ۶۰-۶۱)

اس تنبیہ و تہدید کے بعد منافقین کے حوصلے پست ہو گئے اور ریاست کو نقصان پہنچانا ان کے لیے آسان نہ رہا، لیکن یہود کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔ ان کے خلاف اقدام کیا گیا۔ بالآخر وہ ملک بدر ہو گئے۔

خاندان بسانے کا حق

انسان کو اس کا حق ہے کہ وہ خاندانی زندگی گزارے، اس لیے کہ خاندان اس

کی ایک فطری اور سماجی ضرورت ہے۔ مہذب دنیا اس حق کو تسلیم کرتی ہے۔ خاندان کی اساس ازدواجی تعلق پر ہے۔ اسلام نے اس تعلق کو وجہ سکون اور نسل انسانی کی بقا اور تسلسل کا جائز طریقہ قرار دیا ہے اور اس سے جو رشتے اور تعلقات وجود میں آتے ہیں ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي
خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ
مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا
كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي
تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ (النساء: ۱)

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو
ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے
اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت
سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اللہ سے ڈرو
جس کے نام سے تم ایک دوسرے سے
سوال کرتے ہو اور قطع رحم (خونی رشتوں کو
نقصان پہنچانے) سے بچو۔ بے شک اللہ تم
پر نگراں ہے۔

اسلام خاندان کو کوئی ناپسندیدہ بوجھ نہیں قرار دیتا جس کے اٹھانے میں انسان ناگواری محسوس کرے، بلکہ یہ اس کے نزدیک اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ یہی بات اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ
أَزْوَاجًا ۚ وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ
أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً ۚ وَ
رَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ
يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللَّهِ هُمْ
يَكْفُرُونَ ۝ (النحل: ۷۲)

اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے
جوڑے پیدا کیے اور تمہارے جوڑوں سے
تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے اور کھانے
کے لیے تمہیں پاک چیزیں دیں تو کیا پھر
بھی وہ باطل پر ایمان لائیں گے اور اللہ
کے احسان کا انکار کریں گے۔

اسلام نے خاندان کا ایک پورا نظام عطا کیا ہے۔ اس میں میاں بیوی، ماں باپ، اولاد اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق اور ذمہ داریاں متعین کر دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ اس میں چھوٹوں سے شفقت و محبت اور بڑوں کے عزت و احترام کی تعلیم پائی

جاتی ہے۔ اس نے معاشرے کے ہر فرد کو تاکید کی ہے کہ اس نظام کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کرے اور اسے نقصان نہ پہنچنے دے۔

نجی زندگی میں عدم مداخلت

انسان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اسے اپنی نجی اور شخصی زندگی میں آزادی حاصل رہے۔ اس میں بیرونی مداخلت نہ ہو۔ اسلام نے اسے اس کا ایک جائز حق قرار دیا ہے۔ اور تاکید کی ہے کہ کوئی شخص اپنے گھریا گوشہ تنہائی میں کیا کر رہا ہے اس کی تحقیق و تفتیش نہ کی جائے۔ اگر وہ غلط کام بھی کر رہا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ ہاں اگر وہ علی الاعلان کسی جرم کا ارتکاب کر رہا ہو یا اس کا عمل کسی دوسرے فرد یا معاشرہ کے لیے ضرر رساں ہو تو وہ قانون کی گرفت میں ضرور آئے گا۔ اس سلسلہ میں اسلام نے اصولی ہدایت یہ دی ہے کہ کسی بھی شخص کو پہلے ہی قدم پر محض ظن و تخمین کی بنیاد پر غلط کار اور مجرم نہ قرار دیا جائے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بدکار و بد اطوار ہے اور اس سے کسی خیر کی توقع نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے اور سوء ظن اور بدگمانی سے کام نہ لیا جائے اس لیے کہ بعض گمان بے بنیاد ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آدمی گناہ گار ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ تجسس نہ کیا جائے۔ کسی کی کم زوریوں کی ٹوہ لگانا اور چپکے چپکے اس کی خامیوں کو تلاش کرتے پھرنا غیر اخلاقی اور ناشائستہ رویہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا
مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ أَثْمٌ وَلَا
تَجَسَّسُوا... (الحجرات: ۱۲)

اے ایمان والو! بہت گمان سے بچو، بے
شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کے
عیب نہ تلاش کرو۔

۱۔ اس موضوع پر یہاں بہت مختصر گفتگو کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے راقم کی حسب ذیل کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ 'عورت'۔ اسلامی معاشرے میں۔ 'عورت اور اسلام' اور 'مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ'

سوء ظن اور تجسس کا تعلق شخصی اور نجی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ اگر ایک شخص اجتماعی اور سماجی زندگی میں راست رو ہے تو اس کے متعلق خواہ مخواہ اس بدگمانی کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ خلوت اور تنہائی میں لازماً غلط کار ہوگا۔ اس سے آگے اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے اس کے خفیہ امور کی چھان بین کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی کی اصلاح کی خاطر اس کے نجی حالات سے واقف ہونے کی خفیہ کوشش بھی غلط ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تجسس سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اس سے بگاڑ کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اگر ایک شخص کے علم میں یہ بات آجائے کہ جس جرم کا ارتکاب وہ دوسروں کی نگاہوں سے چھپ کر رہا تھا اب وہ دوسروں پر کھل گئی ہے تو اس کی شرم اور جھجک ختم ہو جائے گی اور وہ اپنی غلط روی پر زیادہ جری ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں یہی نفسیاتی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ حضرت معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے:

انک اذا اتبع عورات الناس
جب تم لوگوں کے خفیہ عیوب کے پیچھے
پڑ جاؤ گے تو انھیں بگاڑ میں ڈال دو گے۔
افسدتهم

یہی بات سربراہ مملکت سے بھی کہی گئی ہے۔ حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الامیر اذا ابتغی الریبة فی
بے شک امیر جب لوگوں میں ایسی چیزیں
ڈھونڈنے لگے جو شک و شبہ میں ڈالتی ہیں
تو ان کو بگاڑ دے گا۔
الناس افسدھم

اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست نجی زندگی کی بھی چھان بین شروع کر دے اور آدمی کے گوشہ تنہائی کی بھی نگرانی ہونے لگے تو اس کی اصلاح نہ ہو سکے گی۔ اندرون خانہ بھی کسی کو آزادی سے محروم کر دیا جائے اور اس کے پیچھے جاسوس لگا دیا جائے جو خلوت

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء بحوالہ بیہقی

۲۔ مسند احمد ۴/۶، ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی النهی عن التجسس

میں بھی اس کا تعاقب کرتا رہے تو اس کے اندر لازماً رد عمل پیدا ہوگا اور وہ غلط کار ہی ہے تو معصیت کی نئی نئی راہیں تلاش کرنے لگے گا۔

کسی کے گھر بلا اجازت داخلہ کی ممانعت

آدمی کا گھر اس کی تنہائی اور خلوت (Privacy) کی خاص جگہ ہے۔ اس میں بے جھجک گھس پڑنا اس کی تنہائی میں مداخلت ہے۔ کسی کے گھر میں داخل ہونے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرے اور صاحب خانہ کی اجازت سے اندر جائے۔ اگر اجازت نہ ملے تو واپس ہو جائے۔ اس پر ناگواری نہ محسوس کرے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا
بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا
وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَإِنْ
لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا
حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ
ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝

اے ایمان والو اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں مت داخل ہو جاؤ، جب تک کہ ان سے انس نہ حاصل کر لو اور (اس کے لیے) ان میں رہنے والوں کو سلام نہ کر لو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ امید ہے تم اسے یاد رکھو گے اگر تم ان مکانوں میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو ان میں مت داخل ہو، جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل جائے۔ اگر تم سے واپس لوٹنے کے لیے کہا جائے تو لوٹ جاؤ۔ یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے

(النور: ۲۷-۲۸) جانتا ہے۔

اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر کسی کے گھر تانک جھانک کرنا اور اندرونی حالات و کوائف جاننے کی کوشش کرنا سخت معیوب ہے۔

حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکان پر تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے دروازے کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔ آپ کے ہاتھ میں کنگھی نہالو ہے یا لکڑی کی کوئی چیز تھی جس سے آپ سر مبارک کھجلا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں یہ سمجھتا

کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو تو اسے میں تمھاری آنکھ میں مار دیتا۔ اجازت لینے کا حکم نگاہ ہی کی وجہ سے تو ہے (بغیر اجازت کے گھر میں جھانک کر دیکھ لینا ایسا ہی ہے جیسے آدمی بے اجازت گھر میں داخل ہو جائے)!

ایک اور حدیث میں ہے:

لو اطلع فی بیتک احد ولم
تأذن له فخذفته بحصاة ففقات
عینه ما کان علیک من جناح^۱
اگر کوئی شخص تمھارے گھر میں جھانکے، تم
نے اسے اجازت نہ دی ہو، اس حرکت پر تم
کوئی کنکر مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دو تو تم پر
کوئی گناہ نہ ہوگا۔

ان احادیث سے امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ گھر میں کسی کے تانک جھانک کرنے پر صاحب خانہ اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر دیت یا تاوان لازم نہیں آئے گا۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ تہدید کا انداز ہے، اس میں کوئی قانون نہیں بیان ہوا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر اس سے اس مسئلہ میں اسلام کا مزاج بہر حال سمجھا جاسکتا ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب ترین عزیزوں کے گھر میں بھی آدمی کو اجازت لے کر ہی داخل ہونا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اپنی ماں سے بھی (اس کی رہائش گاہ میں جانے کے لیے) اجازت لوں؟ آپ نے فرمایا ہاں! اس نے عرض کیا کہ میں تو اسی کے ساتھ رہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا پھر بھی اجازت لو۔ اس نے کہا میں تو اس کا خادم ہوں۔ آپ نے فرمایا اجازت لے کر ہی اس کے پاس جاؤ۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اسے برہنہ دیکھو۔ اس نے کہا نہیں! آپ نے فرمایا: پھر تو تمھیں اجازت

۱۔ بخاری، کتاب الدیات، باب من اطلع فی بیت قوم الخ۔ مسلم کتاب الآداب، باب
تحريم النظر فی بیت غیرہ

۲۔ بخاری کتاب الدیات، باب من اخذ حقه او اقتص دون السلطان۔ مسلم، کتاب
الآداب، باب تحريم النظر فی بیت غیرہ

لینی چاہیے۔ (ورنہ کوئی بھی ناپسندیدہ حالت دیکھنی پڑ سکتی ہے) ۱۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے (Privacy) خلوت میں عدم مداخلت کو کتنی اہمیت دی ہے اور معاشرہ کو اس حق کے احترام کا کس قدر پابند بنایا ہے۔

ملک و ملت کی خدمت کا حق

ملک و ملت کی فلاح و بہبود کی فکر اور اس کے لیے تگ و دو کرنا، ریاست یا کسی خاص فرد یا گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ریاست کے ہر شہری کا حق ہے کہ اسے ملک اور ملت کی خدمت کا موقع حاصل ہو اور اس پر غیر ضروری پابندی نہ لگائی جائے۔ اسلام نے تعلیمی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی، سیاسی ہر طرح کی خدمت کی ترغیب دی ہے اور اس پر معاشرہ کو آمادہ کیا ہے۔ قرآن نے اس کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ إِلَّاهُ
مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ
إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ

ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے
سوائے اس شخص کے جس نے صدقہ کا حکم
دیا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش

(النساء: ۱۱۴) کی (اس نے کار خیر انجام دیا)

کتاب و سنت کے علم کو عام کرنے کی جدوجہد اسلام کے نزدیک بہترین جدوجہد ہے۔

حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ
عَلَّمَهُ ۚ

تم میں بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے
اور دوسروں کو سکھائے۔

آدمی کا صحت مند اور تندرست ہونا اور دوسروں کی فلاح کے لیے کام کرنا اسلام

۱۔ رواہ مالک فی الموطا مرسلًا۔ کتاب الجامع، باب الاستیذان

۲۔ بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب ۲۱۔ ترمذی کتاب ثواب القرآن، باب ماجاء فی تعلیم القرآن

کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

طاقت ور اور قوی مومن اللہ کے نزدیک بہتر اور زیادہ پسندیدہ ہے اس مومن سے جو کم زور اور ضعیف ہے (اس کے باوجود) ہر ایک میں خیر ہے۔

المومن القوی خیر و احب الی اللہ من المومن الضعیف و فی کل خیر^۱

خدمت کی راہ میں تکلیف برداشت کرنے، صبر و ثبات کے ساتھ اسے جاری رکھنے اور ہمت ہار کر نہ بیٹھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جو مسلمان لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کرتا ہے، وہ افضل اور برتر ہے اس مسلمان سے جو ان سے میل جول رکھتا ہے نہ ان کی تکلیف پر صبر کرتا ہے۔

المسلم الذی یخالط الناس و یصبر علی اذاهم افضل من الذی لا یخالطہم ولا یصبر علی اذاهم^۲

افراد اور گروہوں کے نزاعات کو ختم کرنا اور ان کے درمیان تعلقات کو بحال کرنا معاشرہ کی بہترین خدمت اور بہت بڑا کارِ ثواب ہے۔ اس کی فضیلت نفل عبادات سے زیادہ ہے۔ حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ (نفل) روزہ صدقہ و خیرات اور نماز سے اعلیٰ درجہ کا عمل کون سا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم نے عرض کیا کہ ضرور بیان فرمائیے آپ نے

الا اخبرکم بافضل من درجة الصیام و الصدقة و الصلوة قال قلنا بلی قال اصلاح ذات البین و

۱۔ مسلم، کتاب القدر، باب فی الامر بالقوة الخ

۲۔ مسند احمد: ۴۳/۲۔ ترمذی، کتاب صفة القيامة، باب ۵۰۔ ابن ماجہ،

کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء

فساد ذات البین ہی الحالۃ^۱ فرمایا وہ ہے آپس کے تعلقات کو ٹھیک کرنا اور آپس کے تعلقات کا بگاڑ تو (دین و دنیا کو) موٹہ دینے والی چیز ہے۔

دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کا حق بھی ہر ایک کو حاصل ہوگا۔ اس کا ثبوت حضرت ام حبیبہؓ کی روایت سے ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کل کلام ابن آدم علیہ لا لہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر یا اللہ کے ذکر کے الا امر بالمعروف او نہی عن منکر او ذکر اللہ^۲ سوا ابن آدم جو بھی کلام کرتا ہے وہ اس کے لیے نقصان دہ ہی ہے، سود مند نہیں ہے۔

اس طرح اسلام ہر شخص کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ معاشرہ کی فلاح اور انسانوں کی خدمت کے لیے اپنی کوشش کرے، اس کے لیے قوت و طاقت اور صلاحیت پیدا کرے اور خدمت کو بڑے اجر و ثواب کا کام سمجھ کر اُسے انجام دے۔

تنقید اور اصلاح کا حق

اللہ تعالیٰ کے رسول دنیا میں حق کی تبلیغ اور معاشرہ کی اصلاح کا فرض انجام دیتے ہیں اور ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر انجام دیتے ہیں:

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَ يَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ وَ كَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝

وہ اشخاص (پیغمبر) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

(الاحزاب: ۳۹) اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

معاشرہ میں جو خرابیاں پائی جائیں ان پر تنقید اور اصلاح کا اسلام نے ہر ایک کو حق دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

۱۔ مسند احمد: ۴۴۴/۶۔ ترمذی، کتاب صفة القيامة، باب ۵۶۔ ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی اصلاح ذات البین

۲۔ ترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی حفظ اللسان۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنة

یعنی حق بات کہو چاہے وہ کسی کو ناگوار ہی
کیوں نہ گزرے

قل الحق ولو كان مرا

مزید یہ کہ:

اللہ کے (دین کے) معاملہ میں کسی ملامت گر
کی ملامت کی پروا نہ کرو۔

لا تخف في الله لومة لائم^۱

منکرات پر تنقید اور ان کے ازالے کی سعی کو رسول اللہ ﷺ نے تقاضائے ایمان

قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

تم میں سے جو شخص منکر کو دیکھے تو اسے اپنے
ہاتھ (قوت) سے بدل دے۔ اگر اس کی
استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے اسے
بدلے۔ اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے
دل سے برا سمجھے۔ یہ (تقاضائے ایمان کا
کم زور درجہ ہے۔

من رأى منكم منكرا فليغيره
بيده فان لم يستطع فليسانه و
ان لم يستطع فليقلبه و ذالك
اضعف الايمان^۲

حکومت اور ریاست کے اقدامات کی تائید اور حمایت یا اعتراض و تنقید کے
معاملہ میں اسلام نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ اس کی حمایت معروفات میں کی جائے گی۔
اگر اس کے ذریعہ شریعت کا نفاذ عمل میں آ رہا ہے اور وہ معاصی سے اجتناب کر رہی ہے
تو اس کا ساتھ دیا جائے گا، لیکن اگر وہ منکرات کو فروغ دے رہی ہے تو اس کے ساتھ
تعاون نہ ہوگا اور اس سے دوری اختیار کی جائے گی۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ
رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان، بحوالہ بیہقی روایت
حضرت ابو ذرؓ

۲۔ مسلم، کتاب الايمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الايمان۔ ابو داؤد،
کتاب الملاحم، باب الامر والنهي

لا طاعة في معصية انما الطاعة في المعروف^۱ معصیت میں اطاعت نہیں ہوگی، اطاعت تو معروف میں ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

السمع والطاعة على المرء المسلم فيما احب وكره ما لم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة^۲ مرد مسلم کے لیے ضروری ہے کہ اپنے امیر کی بات سنے اور اس کی اطاعت کرے اس معاملہ میں بھی جسے وہ پسند کرتا ہے اور اس معاملہ میں بھی جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔ جب تک کہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ جب معصیت کا حکم دیا جائے تو بات سنی جائے گی اور نہ اطاعت ہوگی۔

نواس بن سمرانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق^۳ مخلوق کی معصیت کے معاملہ میں کسی مخلوق کی بات نہیں مانی جائے گی۔

اسلام، فرد کو سماج میں متحرک اور باعمل دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے بہترین راہ نما خطوط بھی فراہم کر دیے ہیں۔ ان کی پابندی ہو تو سماج شرف و فساد کے خارزار سے پاک ہو سکتا اور امن و امان اور خیر و صلاح کا گلستان بن سکتا ہے۔

۱ بخاری، کتاب اخبار الآحاد، باب ماجاء في اجابة خبر الواحد الخ۔ مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء في غير معصية

۲ بخاری، کتاب الاحکام، باب السمع والطاعة للامام ما لم تكن معصية۔ مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء في غير معصية

۳ مشکوٰۃ المصابيح، کتاب الامارة والقضاء بحوالہ شرح السنة

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

معاشرے میں جسمانی، دماغی، معاشی اور سماجی لحاظ سے کم زور افراد اور طبقات پہلے بھی رہے ہیں اور آج بھی ہیں اور دنیا کے ہر خطہ اور ہر ملک میں ہیں۔ کم زوروں کی تاریخ ان کے حقوق کی پامالی کی تاریخ ہے۔ انھوں نے ظلم و زیادتی کے نرغے میں زندگی گزاری ہے اور بنیادی حقوق تک سے انھیں محروم رکھا گیا ہے۔ سماج کے کم زور افراد اور طبقات پر جو مظالم ہو رہے تھے اسلام نے شروع ہی سے ان کے خلاف پر زور آواز اٹھائی، ان کے حقوق کا علم بلند کیا اور ان کے محافظ کی حیثیت سے سامنے آیا۔ زور آوروں کے ظلم کی چکی میں نادار، یتیم، مسکین اور معذور پس رہے تھے، قرآن نے وقت کے جابروں اور ظالموں کو سخت تنقید کا ہدف بنایا اور ان کے ظلم پر آخرت کی وعید سنائی۔ اس کے ساتھ کم زور اور محروم افراد کے قانونی حقوق واضح کیے اور افلاس و غربت کی وجہ سے سماج میں جن کا درجہ کم تر سمجھا جاتا تھا انھیں مساوی اور برابر کا درجہ عطا کیا۔ یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

عورت کے حقوق

عورت کے ساتھ ہر زمانہ میں ظلم ہوتا رہا ہے۔ مرد نے اسے برابر کی حیثیت نہیں دی، اسے فروتر سمجھا، اس کے حقوق پامال کیے اور اس کے ساتھ غیر اخلاقی بلکہ بسا اوقات غیر انسانی رویہ اختیار کیا۔ عورت اپنی طبعی کم زوری کی وجہ سے یہ سب برداشت

کرتی رہی اور شاید کبھی احتجاج کی بھی جرأت نہیں کی۔

خواتین کے ساتھ عرب کی سوسائٹی میں بدترین سلوک کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو باعثِ ننگ سمجھا جاتا، بعض اوقات انھیں زندہ درگور کر دیا جاتا، ان کی موت کو ان کی حیات سے بہتر تصور کیا جاتا، ان کے مالی حقوق نہ تھے، وراثت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ زندہ بھی ہوتیں تو بوجھ سمجھی جاتیں، بوجھ ہی سمجھ کر ان کی پرورش ہوتی تھی۔ اس صورتِ حال کے خلاف اسلام نے آواز اٹھائی، سماج میں انھیں برابر کا مقام دیا اور ان کے خلاف ہر طرح کی دست درازی کو جرم قرار دیا۔ جاہلاد میں ان کا حق مقرر کیا، ازدواجی زندگی میں عورت و مرد کے حقوق و فرائض متعین کیے، معاشرہ میں انھیں اپنا رول ادا کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ عورت کو مرد کا ضمیمہ نہیں قرار دیا بلکہ اس کی انفرادیت کا اعلان کیا اور کہا کہ دونوں خدا کے بندے ہیں اور اس کے سامنے جواب دہ ہیں، ان میں سے جو حسنِ عمل کا توشہ لے کر اس کے حضور پہنچے گا وہ کام یاب ہوگا اور جو اس سے خالی ہوگا وہ ناکام و نامراد ہوگا۔

بیوی کے حقوق

میاں بیوی کا تعلق انسانوں کے درمیان قریب ترین تعلق اور خاندان کی اساس ہے۔ اسلام نے اس تعلق کا احترام کرنے اور اسے استوار رکھنے کی ہدایت کی ہے اور مرد سے کہا ہے کہ بیوی کی کوئی بات ناپسند ہو تو اسے نظر انداز کر کے اس کے ساتھ معروف کے مطابق رویہ اختیار کرے۔ وہ رویہ معروف کہا جائے گا جسے ہر شریف اور مہذب انسان معقول کہے اور جسے معاشرہ پسندیدہ نظر سے دیکھے۔ قرآن مجید کی ہدایت ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَ يَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ (النساء: ۱۹)

اور بھلے طریقے سے ان کے ساتھ برتاؤ کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھی ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔
حضرت معاویہ قشیریؓ نے آپؐ سے بیوی کے حقوق دریافت کیے تو فرمایا:

ان تطعمها اذا طعمت و
تکسوها اذا اکتسیت ولا
تضرب الوجه ولا تقبح ولا
تہجر الا فی البیت^۱
جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھاؤ اور جب تم پہنو تو
اسے بھی پہناؤ۔ (غصہ سے بے قابو ہو کر) اس
کے منہ پر مت مارو۔ اس کو برا بھلا مت کہو (اس
سے کنارہ کشی کرنی ہو تو گھر سے مت نکال دو
بلکہ) گھر ہی کے اندر اس سے علیحدہ رہو۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

أطعموهن مما تأکلون و
اکسوهن مما تکتسون ولا
تضربوهن ولا تقبحوهن^۲
تم جو کھاؤ وہی ان کو کھاؤ۔ جو پہنو وہی ان کو
پہناؤ۔ ان کو مار پیٹ مت کرو اور برا بھلا
مت کہو۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں
انسان کا جو معیار ہے وہی اس کی بیوی کا بھی ہونا چاہیے۔ خود اعلیٰ معیار کے ساتھ رہنا
اور اسے کم تر معیار کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے
ساتھ میل جول اور تعلقات میں شریفوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیے۔ جہالت اور بربریت کا
مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اکمل المؤمنین ایمانا احسنهم
خلقا و خیارکم خیارکم
لنساءہم^۳
ایمان والوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان
اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے
اچھے ہوں۔ تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی
عورتوں کے حق میں بہتر ہوں۔

۱۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی حق المرأة علی زوجها

۲۔ حوالہ سابق

۳۔ ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها

مطلب یہ کہ اخلاق کی بلندی ہی سے ایمان کا اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے، جو شخص اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرے وہ معاشرہ کا بہترین فرد ہے۔

بیوہ کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے حقوق

عورت پر اس کے شوہر نے بھی ظلم و زیادتی کی ہے لیکن اس کے باوجود بیوی کے لیے بہر حال اس کے دل میں نرم گوشہ رہا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان بڑا جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی الفت و محبت بھی بے مثال سمجھی گئی ہے۔ ان کے مفادات بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ عورت اس کے بچوں کی ماں اور اس کے گھر کی منتظمہ ہوتی ہے اور مرد اس کی جان، مال اور عزت و آبرو کا محافظ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عورت جذباتی طور پر سب سے زیادہ اپنے شوہر سے قربت محسوس کرتی اور زندگی کی تگ و دو میں اس کی رفاقت کو سب سے زیادہ اہم تصور کرتی ہے۔ عورت کی حیثیت یوں بھی کم زور رہی ہے اور جب اس کا یہ سہارا ختم ہو جاتا تو اس کی حیثیت اور زیادہ مجروح ہو جاتی۔ وہ اپنی حفاظت اور نگہداشت کرنے والے سے محروم ہو کر ہر طرف سے ظلم و ستم کا نشانہ بن جاتی۔

عورت اگر بیوہ ہوتی ہے تو خدا کی قدرت اور حکمت کے تحت ہوتی ہے۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا، لیکن دنیا کی بیشتر قوموں کے نزدیک عورت کے لیے بیوگی بہت بڑا داغ تھی۔ اسے منحوس اور بد قسمت سمجھا جاتا اور ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ معاشرے میں اس کی قدر و منزلت باقی نہ رہتی اور اس کی عزت و آبرو ختم ہو جاتی۔ اس کے اندر اپنی محرومی اور بد نصیبی کا اتنا شدید احساس پیدا ہو جاتا کہ بسا اوقات وہ خودکشی پر مجبور ہو جاتی اور زندہ بھی رہتی تو اس طرح کہ موت اس زندگی سے بہتر ہوتی۔ آج بھی بہت سے معاشروں میں بیوہ کا یہی حال ہے۔ اس پہلو سے بیوگی عورت کے لیے ایک سماجی اور نفسیاتی سانحہ بھی ہے۔ جس عورت کے ساتھ یہ سانحہ پیش

آئے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ ہمارے حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بیواؤں اور مسکینوں کی خدمت اور تعاون اور اس سلسلے میں تگ و دو کو راہِ خدا میں جہاد اور شب و روز کی نفل عبادت کے برابر قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

الساعي على الارملة والمسكين
كالجاهد في سبيل الله و
احسبه قال و كالقائم لا يفتر و
كالصائم لا يفطر ۱

بیوہ اور مسکین کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جو خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو مسلسل خدا کی یاد میں کھڑا رہتا ہے اور لگاتار روزے رکھتا ہے۔

اسلامی قانون کے تحت عورت بیوہ ہونے کی وجہ سے اپنے قانونی حقوق سے محروم نہیں ہوتی۔ شوہر کے ترکہ یا وراثت میں اس کا حصہ متعین ہے۔ اگر اس کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے تو شوہر کے بعد اس کا نان نفقہ اس کی اولاد یا ماں باپ پر لازم ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسے دوسرے نکاح کا حق ہے۔ وہ اپنی آزاد مرضی سے دوبارہ ازدواجی زندگی شروع کر سکتی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں بیوہ سے نکاح کا رواج رہا ہے۔ یہ اس کے بہت سے مسائل کا حل ہے۔

یتیموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

یتیم اصطلاح میں اس نابالغ بچہ کو کہا جاتا ہے جسے اپنے باپ کا سایہ نصیب نہ ہو لیکن جس بچہ کی ماں نہ ہو اسے بھی اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے یتیم کہا جاسکتا ہے۔ کسی بھی بچے کے لیے یتیمی سب سے بڑا سانحہ ہے۔ ماں باپ کے نہ ہونے کی وجہ

۱ بخاری، کتاب الادب، باب الساعي على المسكين۔ مسلم، کتاب الزهد، باب فضل الاحسان الى الارملة

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

سے وہ اپنے قریب ترین ہمدردوں اور حقیقی سرپرستوں سے محروم ہوتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت اور روزگار ہی کے لیے نہیں بلکہ بسا اوقات اپنی نگہداشت اور پرورش کے لیے بھی دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے اپنی اولاد کی طرح دیکھنا، اس کی پرورش کی زحمت برداشت کرنا، اس کی تعلیم و تربیت کا بوجھ اٹھانا اور اسے اس قابل بنانا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے آسان نہیں ہے۔ لیکن جو شخص یہ مشکل کام انجام دے اسے آخرت میں رسول اکرم ﷺ کی قربت اور معیت کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ حضرت سہل بن سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انا وكافل الیتیم فی الجنة هكذا
وقال باصبیہ السبابة والوسطیٰ
میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں
اس طرح قریب ہوں گے۔ یہ کہہ کر آپ
نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے
اشارہ فرمایا۔

قربت دار کا حق مقدم ہے اور اس کی خدمت کا اجر و ثواب زیادہ ہے، لیکن اگر یتیم سے قربت اور رشتہ داری کا تعلق نہ ہو تو بھی اس کی نگہداشت اور کفالت پر وہی اجر و ثواب ملے گا جو کسی قربت دار یتیم کی کفالت پر ملتا ہے۔ اسے بھی رسول اللہ ﷺ نے قیامت میں اپنی رفاقت کی بشارت دی ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

كافل الیتیم له او لغيره انا وهو
كھاتین فی الجنة
یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ اس کا ہو یا
کسی دوسرے کا، وہ اور میں جنت میں اس طرح
قریب ہوں گے (جیسے یہ دو انگلیاں ہیں)

امام نوویؒ فرماتے ہیں۔ یتیم کی کفالت کا مطلب ہے اس کے کھانے پینے اور تعلیم و تربیت وغیرہ کا بندوبست کرنا۔ یہ فضیلت اس شخص کو بھی حاصل ہوگی جو اپنے

۱۔ بخاری، کتاب الادب، باب فضل من یعول یتیم

۲۔ مسلم، کتاب الزہد، باب فضل الاحسان الی الارملة

پیسہ سے یہ خدمت انجام دے اور اس شخص کو بھی جو یتیم ہی کا مال شریعت کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت ان مدت میں خرچ کرے۔^۱

مالک بن الحارثؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے:

من ضم یتیمًا بین ابویں مسلمین
الی طعامہ و شرابہ حتی ینستغنی
عنہ وجبت له الجنة^۲

جو شخص کسی یتیم کو جو مسلمان ماں باپ سے
ہو، اپنے کھانے پینے میں اس وقت تک
ساتھ رکھے جب تک کہ وہ (بڑا ہو کر) اس
سے بے نیاز ہو جائے تو اس کے لیے جنت
واجب ہوگی۔

اس سلسلے کی ایک اور حدیث حضرت عبد اللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من عال ثلاثة من الایتام کان کمن
قام لیلہ و صام نہارہ و غذا و راح
شاهرا سیفہ فی سبیل اللہ و
کنت انا و هو فی الجنة اخوان
کما ان ہاتین اختان والصق
اصبعیہ السبابة والوسطی^۳

جو شخص تین یتیموں کی پرورش کرے وہ اس
شخص کی طرح ہے جس نے رات میں قیام
کیا، دن میں روزہ رکھا اور صبح و شام اپنی
تکوار لیے ہوئے خدا کی راہ میں جہاد کرتا
رہا۔ میں اور وہ جنت میں اس طرح قریب
ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں ہیں۔ یہ کہہ کر
آپ نے انگشت شہادت اور درمیان کی
انگلی ملائی۔

عورت اور یتیم کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی اور ان کی حق تلفی سے رسول اکرمؐ
نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے:

۱۔ نووی، شرح مسلم، جلد: ۹ جزء: ۱۸، کتاب الزہد والرقائق باب الاحسان الی الارملة والمسکین والیتیم

۲۔ مسند احمد، ۳/۳۴۴ قال المنذری اسنادہ حسن، الترغیب والترہیب، کتاب البر والصلة، باب الترغیب فی کفالة الیتیم ورحمته... الخ ۳/۲۳۵

۳۔ ابن ماجہ، کتاب الادب، باب حق الیتیم

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

اللهم انی اخرج حق الضعیفین
الیتیم والمرأة^۱

اے اللہ جو شخص ان دو کم زوروں۔ یتیم اور
عورت کا حق ضائع کرے میں اسے خطا کار
اور مجرم ٹھہراتا ہوں (اور اس سے بچنے کی
اسے تاکید کرتا ہوں)

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خیر بیت فی المسلمین بیت فیہ
یتیم یحسن الیہ و شر بیت فی
المسلمین بیت فیہ یتیم یساء الیہ^۲
مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس
میں کسی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور
مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس
میں کسی یتیم کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔

یتیم کم سمجھ اور نا تجربہ کار ہوتا ہے۔ اسے اپنے نفع و نقصان کا پوری طرح
احساس نہیں ہوتا۔ اس لیے آسانی سے اس کا حق مارا جاسکتا اور اسے نقصان پہنچایا
جاسکتا ہے۔ اسلام نے سختی سے اس کی ممانعت کی ہے۔ اس نے کہا یتیم صاحب حیثیت
ہو تو اس کے مال و جایداد کی حفاظت کی جائے، اسے ترقی دینے کی کوشش کی جائے اور
اس سے کسی قسم کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اس کے مال میں تصرف ہو تو بھلے طریقے
سے ہو، اسے برباد کرنے کے ارادے سے نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ
أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (الانعام: ۱۵۱)
یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقہ
سے جو بہترین ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی
کو پہنچ جائے۔

جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں انھیں اس نے ان الفاظ میں جہنم کی وعید سنائی:

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ
ظُلْمًا إِنَّهُمْ يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا
وَسَيَصْلُونَ سَعِيرًا ○ (النساء: ۱۰)
بے شک وہ لوگ جو یتیموں کے مال کھاتے ہیں
وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور
جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

۱۔ مسند احمد: ۴۳۹/۲، ابن ماجہ، کتاب الادب، قال النووی حدیث حسن رواہ

النسائی باسناد جید، ریاض الصالحین ص ۱۲۲

۲۔ ابن ماجہ، کتاب الادب، باب حق الیتیم۔ الادب المفرد: ۲۳۱/۱

رسول اللہ ﷺ نے سات گناہوں کو موبقات (ہلاک کر دینے والے گناہ) سے تعبیر کیا ہے۔ ان میں ایک یتیم کا مال کھانا بھی ہے۔^۱

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ یتیموں کے سر پرستوں نے ان کے کھانے پینے تک کا نظم الگ کر دیا۔ اس لیے کہ مشترک نظم میں اس بات کا ڈر تھا کہ ہزار احتیاط کے باوجود یتیم کی کوئی چیز اور اس کے مال کا کوئی جزء ان کے حصہ میں آجائے اور ان کا شمار بھی اس کا مال کھانے والوں میں ہو جائے۔ یہ احتیاط اس قدر بڑھی کہ ان کا کھانا بچ جاتا تو حفاظت سے رکھ دیا جاتا تاکہ وہ خود ہی دوبارہ اسے استعمال کریں۔ بسا اوقات وہ خراب بھی ہو جاتا لیکن یتیم کے سرپرست اسے اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے انتظام میں سخت زحمت پیش آرہی تھی۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے دوبارہ اپنا اور ان کا مشترک نظم رکھا۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ
إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ
تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ
يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ
وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَا غَنَبَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (البقرة: ۲۲۰)

وہ تم سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں
(کہ ان کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا
جائے) کہو جس میں ان کی بھلائی ہو وہ بہتر
ہے۔ اگر تم ان کو کھانے پینے اور رہنے سہنے
میں اپنے ساتھ ملا کر رکھو تو (بھی کوئی حرج
نہیں کیوں کہ) وہ تمہارے بھائی ہیں، اللہ
جانتا ہے کون بگاڑنے والا ہے اور کون بنانے
اور سنوارنے والا۔ اللہ چاہتا تو تم کو مشقت
میں ڈال دیتا۔ وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اس میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یتیم کے مال کے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا جائے جو اس کے حق میں مفید اور بہتر ہو۔ جیسا کہ فقہانے لکھا ہے اس کی

۱ بخاری، کتاب الحدود، باب رمی المحصنات۔ مسلم کتاب الایمان، باب بیان الکبائر و اکبرها۔

۲ ابو داؤد، کتاب الوصایا، باب مخالطة الیتیم فی الطعام۔ نسائی، کتاب الوصایا، باب ما للوصی من مال الیتیم

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس کا مال کسی مناسب کاروبار میں لگایا جائے۔ محنت اور سرمایہ کے اصول پر کسی محنتی اور تجربہ کار آدمی کے حوالے کیا جائے۔ سرپرست کو اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ خود ہی یتیم کے مال سے تجارت کرے یا کسی دوسرے کی تجارت میں اس کا سرمایہ لگائے۔ یتیم کے ساتھ خیر خواہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے یا اسے کسی ہنر اور صنعت و حرفت کے سیکھنے میں لگایا جائے۔ بعض اوقات خیر خواہی کا تقاضا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی معقول رشتہ کرادیا جائے۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ مطلب یہ کہ تمہیں ان کے ساتھ وہ معاملہ کرنا چاہیے جو تم اپنے ایک بھائی کے ساتھ کر سکتے ہو۔

ایک جگہ یتیموں کے سرپرستوں سے قرآن مجید نے کہا کہ تم ان کے مال کے محافظ اور نگراں ہو، تمہارا کام اس کی حفاظت اور نگہداشت ہے۔ جب وہ سن شعور کو پہنچ جائیں تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو، ان کے بڑے ہونے سے پہلے اسے کھاپی کر ختم نہ کر دو۔ خدا نے تمہیں وسعت اور فراخی عطا کی ہے تو بہتر یہ ہے کہ کسی معاوضہ کے بغیر ان کی خدمت کرو۔ لیکن اگر تنگ دست اور حاجت مند ہو تو دستور کے مطابق اپنی اجرت اور معاوضہ تو لے سکتے ہو، بے دردی سے اڑا نہیں سکتے۔

وَابْتَالُوا الَّتِي حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا
النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا
فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا
تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ
يَكْبَرُوا ۚ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا
فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا
فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ط (النساء: ۶)

یتیموں کو آزما کر دیکھو۔ یہاں تک کہ وہ
نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر جب تم ان
کے اندر ہوشیاری اور سوجھ بوجھ دیکھو تو ان
کا مال ان کے حوالے کر دو۔ یتیموں کا مال
ضرورت سے زیادہ اور جلدی جلدی (اس
خیال سے) مت کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر
اس کا مطالبہ کریں گے۔ جو صاحب حیثیت
ہے وہ اس سے بچا رہے اور جو محتاج ہے وہ
معروف طریقے سے کھائے۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے بھاص، احکام القرآن: ۱/۴۰۰، ۴۰۱

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں بالکل غریب اور نادار ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے، البتہ ایک یتیم کی نگہداشت کرتا ہوں، کیا اس کے مال سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا:

کل من مال الیتیم غیر مسرف
ولا مبادر ولا متاثل
یتیم کے مال سے تم کھا سکتے ہو لیکن نہ تو ضرورت سے زیادہ اور نہ جلدی جلدی اور نہ اس طرح کہ اس کا اصل سرمایہ ہی ختم ہو جائے۔

غلاموں اور محکوموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

دنیا میں قدیم ترین زمانے سے غلامی کا رواج رہا ہے اور جب سے اس کا رواج ہے غلاموں کے ساتھ ظلم و زیادتی بھی ہوتی رہی ہے۔ غلام کو نہ تو جدوجہد اور تنگ و دو کی آزادی تھی اور نہ کسی چیز پر اس کا حق ملکیت ہی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی جان و مال، اس کی صلاحیتوں اور اس کے اوقات پر اس کے مالک کا پورا اختیار ہوتا۔ وہ جس طرح چاہتا اس کے ساتھ معاملہ کرتا۔ بعض اوقات غلاموں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا ہے جو جانوروں کے ساتھ بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ پھر یہ کہ اس ظلم و زیادتی پر ان کو شکوہ و فریاد تک کی اجازت نہیں رہی ہے۔ اسی طرح بادشاہوں نے رعایا کے ساتھ، حاکموں نے محکوموں کے ساتھ، امیروں اور رئیسوں نے نوکروں اور خادموں کے ساتھ، زور آوروں اور طاقت والوں نے زیر دستوں اور کم زوروں کے ساتھ ہر طرح کی ظلم و زیادتی کی اور ان کے جائز حقوق کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ اسلام نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ہر زیر دست اور محکوم کے حقوق متعین کیے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی۔ اس کا اندازہ ان ہدایات سے ہو سکتا ہے، جو اس نے غلاموں کے سلسلے میں دی ہیں۔

حضرت ابو ذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ ابو داؤد، کتاب الوصایا، باب ماجاء فی مالولی الیتیم

بلاشبہ تمہارے بھائی تمہارے غلام ہیں۔
اللہ نے ان کو تمہارے زیر دست کر رکھا
ہے۔ پس جس کسی کا بھائی اس کے ماتحت
ہو اسے وہ کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہ
پہنائے جو خود پہنتا ہے۔ ان پر کام کا اتنا
بوجھ نہ ڈالو کہ اسے وہ اٹھانہ سکیں۔ اگر ان
کی طاقت سے زیادہ ان کو کام دو تو اس
کے پورا کرنے میں ان کی مدد کرو۔

ان اخوانکم خولکم جعلہم اللہ
تحت ایدیکم فمن کان اخوہ
تحت یدہ فلیطعمہ مما یا کل
ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوہم
ما یغلبہم فان کلفتموہم ما
یغلبہم فاعینوہم۔^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

غلام کا حق ہے کہ اسے کھانا اور لباس فراہم کیا
جائے اور اسے اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف
نہ دی جائے۔

للمملوک طعامہ و کسوتہ ولا
یکلف الا ما یطیق۔^۲

حضرت ابو ذرؓ کی روایت کے ذیل میں امام نوویؒ فرماتے ہیں: علماء کا اس پر
اجماع ہے کہ مالک جو کھائے اور جو پہنے وہی غلام کو کھلانا اور پہنانا فرض تو نہیں البتہ
مستحب ہے۔ فرض یہ ہے کہ شہروں اور علاقوں کا بھی اور افراد کا بھی جو دستور ہو اس کے
مطابق اسے کھانا کپڑا دیا جائے اور اس کی دوسری ضرورتیں پوری کی جائیں، چاہے یہ
وہی کھانا کپڑا ہو جو مالک استعمال کرتا ہے یا اس سے فروتر یا اس سے برتر۔ اگر مالک
اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر یا بخیلی کی وجہ سے اپنی سطح کے لوگوں کے معیار سے کم تر درجہ کی
زندگی گزار رہا ہو تو وہ غلام کو اس کی مرضی کے بغیر اس طرح کی زندگی گزارنے پر مجبور
نہیں کر سکتا۔ علماء کا اس پر بھی اجماع ہے کہ غلام کی طاقت سے زیادہ مالک اس پر کام کا
بوجھ نہیں ڈال سکتا۔ اس طرح کا بوجھ ڈالے تو اسے بذات خود یا کسی اور کے ذریعے اس
کی مدد لازماً کرنی ہوگی۔^۳

۱ بخاری، کتاب العتق، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم العبد اخوانکم۔

مسلم کتاب الایمان، باب صحبة الممالیک

۲ مسلم، کتاب الایمان، باب اطعام المملوک مما یا کل

۳ نووی، شرح مسلم: جلد ۶، جز: ۱۱، ص: ۱۱۱

حدیث میں ہے کہ غلام کے ساتھ ناروا زیادتی ہو تو اسے آزاد کر دیا جائے۔
حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنے غلام کو مارا تو اس کی پیٹھ پر اس کا نشان پڑ گیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے دیکھا تو کہا میں نے غالباً تمہیں تکلیف پہنچائی ہے؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا۔ جاؤ تم آزاد ہو۔ پھر زمین سے کوئی تنکا اٹھایا اور کہا اس کے برابر بھی اس کا اجر نہیں ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من لطم مملوکاً او ضربہ
فکفارتہ ان یعتقہ۔
جو اپنے غلام کو منہ پر تھپڑ یا کسی اور جگہ مارے تو
اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دے۔

سوید بن مقرنؓ کہتے ہیں۔ ہماری ایک لونڈی تھی جسے ہمارے ایک آدمی نے غصے میں تھپڑ مار دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا اسے آزاد کر دو، لوگوں نے عرض کیا ہمارے پاس دوسری خدمت گار نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا جب اس کی ضرورت نہ رہے (یا کوئی دوسرا انتظام ہو جائے) تو اسے آزاد کر دو۔^۱

حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا۔ پیچھے سے کسی کی آواز سنی۔ ابو مسعود! خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی کہ تمہیں اس پر حاصل ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ موجود تھے، میں نے کوڑا زمین پر ڈال دیا اور کہا کہ اس کے بعد کسی غلام کو کبھی نہیں ماروں گا اور یہ غلام آج سے آزاد ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں چھو جاتی۔^۲

حدیث میں غلام پر جھوٹا الزام لگانے اور اسے بدنام کرنے پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

^۱ مسلم، کتاب الأیمان، باب صحبة الممالیک و کفارة من لطم عبده۔ مسند احمد: ۶۱/۲

^۲ مسلم، کتاب الأیمان، باب صحبة الممالیک و کفارة من لطم عبده

^۳ مسلم، کتاب الأیمان، باب صحبة الممالیک و کفارة من لطم عبده۔ ابوداؤد کتاب الادب

جو اپنے غلام پر (زنا کی) تہمت لگائے اور
جو بات کہی گئی ہے وہ اس سے بری ہے
(بے گناہ ہے) تو قیامت کے روز اسے
کوڑے لگائے جائیں گے الا یہ کہ وہ ویسا ہی
ہو جیسا کہ کہا گیا ہے۔

من قذف مملو کہ وہو برئ
مما قال جلد یوم القیامۃ
الا ان یکون کما قال^۱

امام نوویؒ فرماتے ہیں اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ غلام پر تہمت لگانے سے حد قذف تو جاری نہیں ہوگی، البتہ اس کی تعزیر (جو حکومت طے کرے) ہوگی۔^۲
غلامی کے مسئلے کا تعلق جنگی قیدیوں سے ہے۔ موجودہ دور میں ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ نہ اٹھے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اسلام نے غلامی کو بالکل ختم کر دیا یا اسے سیاسی حالات پر چھوڑ دیا، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی، مکاتبت کا طریقہ رائج کیا (النور: ۳۳)، جس میں غلام اور اس کے مالک کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ غلام متعین رقم ادا کر کے آزادی حاصل کر لے گا۔ آدمی کو یہ حق بھی ہے کہ اپنی زندگی کے بعد غلام کو آزاد قرار دے دے۔ بعض گناہوں اور غلطیوں کے کفارے میں یہ بھی شامل کیا گیا کہ غلام کو آزاد کیا جائے۔ جیسے غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کرنا (النساء: ۹۲) قسم توڑنا (المائدہ: ۸۹) یا بیوی کو ماں قرار دے کر اس سے رجوع کرنا (المجادلہ: ۳) ان سب تدبیروں کے باوجود اگر غلام ہو تو اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی، اس پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنے سے منع کیا۔ اس کے حقوق متعین کئے اور اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کی۔

مذکورہ بالا احادیث کا تعلق اصلاً غلاموں سے ہے، لیکن ان کی روشنی میں ملازموں، مزدوروں اور ماتحت طبقات کے سلسلے میں حسب ذیل اصول وضع کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ بخاری، کتاب الحدود، باب قذف العبد، مسلم، کتاب الایمان، باب من قذف مملو کہ بالزنا

۲۔ نووی، شرح مسلم: جلد ۶، جزء ۱۱، ص ۱۱۹

۳۔ نووی، شرح مسلم: جلد ۶، جزء ۱۱، ص ۱۱۱

- ۱- ملازم کی تنخواہ اتنی ضرور ہو جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔
- ۲- مالک کو یہ حق نہیں ہے کہ ملازم کو زرد و کوب کرے یا اسے جسمانی سزا دے اگر اس سے یہ غلطی سرزد ہو جائے تو اس پر تاوان لگایا جائے گا۔
- ۳- مالک کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ ملازم پر جھوٹے الزامات لگا کر اسے بدنام کرے یا اس کی ملازمت ختم کر دے۔

محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

قرآن مجید نے بار بار مسکینوں اور محتاجوں کی مدد پر ابھارا ہے اور ان سے بے توجہی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی سے منع کیا ہے (مثلاً ملاحظہ ہو: البلد: ۱۶)۔ وہ جب حسن سلوک کا ذکر کرتا ہے تو والدین اور قرابت داروں کے ساتھ بالعموم مسکینوں کا بھی ذکر کرتا ہے (النساء: ۳۶، اسراء: ۲۶)۔ ایک جگہ فرمایا: وراثت کا مال تقسیم ہو تو جن رشتہ داروں کا حصہ نہیں ہے، ان کا اور یتیموں اور مسکینوں کا خیال رکھا جائے (النساء: ۸) جو لوگ مسکینوں اور محتاجوں کی بھوک پیاس اور فقر و فاقہ کا خیال نہیں کرتے اور ان کے ساتھ تعاون اور ہم دردی کا رویہ نہیں اختیار کرتے اس نے ان کی سخت مذمت کی ہے اور انہیں جہنم کی وعید سنائی ہے (الحاقہ: ۳۴، الفجر: ۱۴، الماعون: ۳)۔ احادیث میں مختلف پہلوؤں سے محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جو شخص کسی مصیبت زدہ کی فریاد رسی کرے
اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں تہتر
مغفرتیں لکھے گا۔ ان میں سے ایک (کا نتیجہ
یہ ہوگا) اس کے سارے کام درست
ہو جائیں گے باقی بہتر قیامت کے دن اس
کے درجات میں اضافہ کا سبب ہوں گے۔

من اغاث ملهوا فكتب الله له
ثلثا و سبعين مغفرة واحدة منها
صلاح امره كله و ثنتان و سبعون
له درجات يوم القيامة

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الشفقة والرحمة علی الخلق بحوالہ بیہقی

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے اپنی سنگ دلی کی شکایت کی اور علاج پوچھا تو آپ نے فرمایا:

اطعم المسکین وامسح رأس الیتیم^۱
مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو۔ (سنگ دلی جاتی رہے گی)

حدیث میں غریبوں اور مسکینوں سے محبت کا بھی حکم دیا گیا ہے، اس لیے کہ محبت کے بغیر خدمت نہیں ہو سکتی۔ جو شخص ان سے محبت کرے وہی ان کے ساتھ حسن سلوک بھی کر سکتا ہے۔ حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں:

امرنی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم بسبع امرنی بحب المساکین والدنومہم^۲
میرے محبوب رسول اللہ ﷺ نے مجھے سات باتوں کی ہدایت فرمائی۔ (ان میں سے ایک یہ تھی کہ) آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں مسکینوں سے محبت کروں اور ان کی قربت اختیار کروں۔

رسول اللہ ﷺ کو خود بھی مسکینوں سے جو محبت اور ہمدردی تھی اور جو تعلق خاطر ان سے آپ محسوس فرماتے تھے، اس کا اظہار آپ کی ایک دعا سے ہوتا ہے۔ آپ نے دعا فرمائی۔

اللہم احینی مسکینا و امتنی مسکینا واحشرنی فی زمرة المساکین
اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکینی ہی کی حالت میں موت دے اور مسکینوں کے زمرے میں اٹھا۔

حضرت عائشہؓ نے اس دعا کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ مساکین، دولت مندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں پہنچیں گے۔ پھر آپ نے نصیحت فرمائی:

یا عائشة احبی المساکین و قریہم فان اللہ یقربک یوم القیمة^۳
اے عائشہ! مسکینوں سے محبت کرو اور ان کو اپنے سے قریب کرو۔ اللہ تمہیں قیامت کے روز اپنے سے قریب کرے گا۔

۱۔ مسند احمد: ۶/۱۳۹ ۲۔ مسند احمد: ۵/۱۵۹

۳۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، باب فضل الفقراء بحوالہ ترمذی و بیہقی

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

اسلام نے ان اخلاقی تعلیمات کے ساتھ مسکینوں اور محتاجوں کی فلاح و بہبود کی مختلف صورتیں بھی رکھی ہیں۔

۱- بعض عبادات میں نقص یا کمی کی تلافی کے لیے فدیہ رکھا گیا ہے۔ اس کی ایک صورت متعین تعداد میں مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اسی طرح بعض غلطیوں کا کفارہ بھی مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

۲- مالِ غنیمت میں مسکینوں اور محتاجوں کا حصہ رکھا گیا ہے (الانفال: ۴۱)

۳- مصارفِ زکوٰۃ کی جو مددات بیان ہوئی ہیں ان میں سب سے پہلی مد فقراء اور مساکین کی ہے۔ (التوبہ: ۶۰)

ناداروں اور مسکینوں کو معاشی لحاظ سے اوپر اٹھانے کے لیے جائز حدود میں فرد جو کوشش کرے اور ریاست جو اقدامات کرے وہ سب اسلامی تعلیم اور اس کی روح کے عین مطابق ہوں گے۔

ضعیفوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

جو شخص جسمانی طور پر کم زور ہوتا ہے وہ معاشی دوڑ دھوپ میں بالعموم پیچھے رہ جاتا ہے اور دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص خوشی سے اس کی خدمت نہیں کرتا بلکہ اسے ایک طرح کا بوجھ سمجھتا ہے۔ احادیث میں اس ذہن کی اصلاح کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تمہیں یہاں جو کچھ ملتا ہے وہ ان ہی کم زوروں اور لاچاروں کے طفیل میں ملتا ہے۔ اس لیے ان پر احسان مت جتاؤ بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ان کی خدمت کی توفیق بخشی۔ اللہ تعالیٰ اصلاً ان کم زوروں کو رزق پہنچانا چاہتا ہے لیکن اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت اس نے تمہیں اس کا واسطہ بنایا ہے۔ اگر تم نے اس میں غفلت اور کوتاہی کی تو درمیان سے تمہارا واسطہ ختم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ دوسروں سے یہ خدمت لے لے گا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سخاوت اور شجاعت میں بہت مشہور تھے۔

ان کے صاحبزادے مصعب بن سعدؓ کہتے ہیں کہ انھیں یہ احساس ہوا کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کو خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ ان سے بہتر ہیں (غالباً ان کو یہ خیال بھی ہوا کہ ان کی خدمات کی وجہ سے مال غنیمت میں ان کا حق دوسروں سے زیادہ ہے) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

هل ترزقون و تنصرون الا تمھیں تمھارے ضعیفوں ہی کی وجہ سے رزق
بضعفائکم^۱ دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے۔

یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

انما ينصر الله هذه الامة اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد تو اس کے ضعیفوں
بضعیفھا بدعوتھم و صلوتھم کی بنا پر کرتا ہے۔ ان کی دعا، ان کی نماز اور
واخلاصھم^۲ ان کے اخلاص کی وجہ سے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ افراد ہی کو نہیں پوری امت کو بھی اگر غلبہ اور کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس کے جواں مردوں اور بہادروں کو نہ تو اترانا چاہیے کہ ان کے ذریعے یہ کارنامہ انجام پایا اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ معاشرے کے کم زوروں اور ناتوانوں کے مقابلے میں وہ اونچی حیثیت کے مالک ہیں، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کم زوروں کا مقام خدا کے نزدیک بہت اونچا ہے اور ان ہی کی آہ و زاری اور دعاؤں سے ان کو کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

ابغونی الضعفاء فانما ترزقون و ابغونی الضعفاء فانما ترزقون و
تنصرون بضعفائکم^۳ ضعیفوں کو تلاش کر کے میرے پاس لاؤ اس
لیے کہ تمھیں اپنے ضعیفوں ہی کی وجہ سے
رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے۔

۱ بخاری، کتاب الجہاد، باب من استعان علی الضعفاء

۲ نسائی، کتاب الجہاد، باب الاستنصار بالضعیف

۳ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الانتصار بزل الخیل۔ والضعفة۔ نسائی، کتاب الجہاد، باب الانتصار بالضعیف۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ابغونی فی ضعفائکم فانما
ترزقون و تنصرون بضعفائکم
مجھے اپنے ضعیفوں میں تلاش کرو۔ اس لیے
کہ ضعیفوں کی وجہ سے تمہیں رزق بھی دیا
جاتا ہے اور مدد بھی کی جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ ضعیفوں کو تلاش کرو تا کہ ان کا حق ادا کیا جائے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم
ان کو کھلا پلا رہے ہو بلکہ یہ سمجھو کہ تمہیں جو کچھ بھی ملتا ہے ان کی وجہ سے ملتا ہے۔
رسول اللہ ﷺ خود بھی ہر وقت ضعیفوں کی خبر گیری فرماتے رہتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ
میں تمہیں ضعیفوں اور لاچاروں ہی میں مل سکتا ہوں، مجھے ڈھونڈنا ہو تو انہیں کے درمیان
ڈھونڈو۔ امیروں اور رئیسوں اور خوش حال لوگوں کے درمیان تم مجھے نہیں پاؤ گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قسم کا ذہن پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پیدا ہو جائے تو
انسان کم زوروں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کو بخشش اور احسان نہیں سمجھے گا۔ بلکہ اپنا
ایک فرض تصور کرے گا۔ ان کا حق ادا کرنے کے باوجود اسے ہمیشہ اپنی کوتاہی کا احساس
دامن گیر رہے گا۔

قرآن مجید نے اہل ایمان کا ایک اعلیٰ وصف یہ بیان کیا ہے کہ انسان کے مال
میں سائل اور محروم کا حصہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ
وَالْمَحْرُومِ (الذاریات: ۱۹)
ان کے مالوں میں حق ہوتا ہے سائل اور
محروم کا۔

دوسری جگہ فرمایا کہ ان کے مال میں سائل اور محروم کا متعین حق ہوتا ہے۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ
لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ
اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا متعین
حق ہوتا ہے۔

(المعارج: ۲۴-۲۵)

۱۔ ترمذی، ابواب فضائل الجہاد، باب ما جاء فی الاستفتاح بصعاليك المسلمين

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

سائل سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی ضرورت بیان کرتا اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جو وسائل حیات سے محروم ہونے کے باوجود دست سوال دراز نہیں کرتا۔ سائل اور محروم میں بوڑھے، بیمار، اpanچ، معذور، لاوارث بچے اور اس طرح کے سب ہی لوگ آجاتے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہ ہوں گے جو اپنی ضروریات بیان کریں گے اور مدد کے طالب ہوں گے، اور وہ بھی ہوں گے جو اپنی غربت اور افلاس کا ذکر کرنا اور مدد طلب کرنا پسند نہ کریں گے۔ ایک مومن کے مال میں ان سب کا لازماً حصہ ہونا چاہیے اور ان کی احتیاج اور محرومی کو ختم کرنا حکومت کی بھی ذمہ داری ہے۔

۱۔ کم زور افراد اور طبقات کے حقوق کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' طبع دوم ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق^۱

اللہ تعالیٰ کا اس شخص پر بڑا احسان ہے جسے اس نے صحیح سالم اور تندرست و توانا پیدا کیا۔ دل، دماغ، آنکھ، کان، ناک اور ہاتھ پیر عطا کیے۔ اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو ان میں سے کسی نہ کسی نعمت سے محروم ہیں۔ اسلام نے ان کے اندر ہمت و حوصلہ پیدا کیا اور احکام شریعت میں ان کی رعایت کی۔ اس کے ساتھ اس نے ان کی خدمت، دل جوئی اور ہمدردی کو ہر اس شخص کا دینی اور اخلاقی فرض قرار دیا جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جسمانی اور دماغی نعمتوں سے بہرہ یاب ہے۔

صبر کی تلقین

اسلام نے سب سے پہلے خود معذور (Handicap) کو صبر کی تلقین کی ہے۔ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مختلف طریقوں سے آزماتا ہے۔ تمہارا امتحان تمہاری معذوری میں ہے۔ صبر کرو گے تو اجر پاؤ گے۔ خدا کے فیصلہ کو خوش دلی سے قبول کرنا انسان کو اس کے انعام و اکرام کا حق دار بناتا ہے۔ جزع فزع یا شکوہ و شکایت بے سود ہے۔ اس سے کسی نقصان کی تلافی نہیں ہوتی، البتہ انسان صبر کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔

۱۔ کم زور افراد اور طبقات کے ذیل میں معذور (Handicap) بھی آتے ہیں۔ اسلام نے ان کے سلسلے میں کافی تفصیلی ہدایات دی ہیں۔ یہاں الگ سے ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حوالے سے فرمایا کہ وہ فرماتا ہے:

اذا ابتلیت عبدی بحبیثیہ
فصبر عوّضته منہما الجنة یرید
عینیہ^۱
جب میں اپنے بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں کے ذریعے آزمائش میں ڈالوں اور وہ صبر کرے تو میں ان کے عوض اسے جنت عطا کروں گا۔ دو محبوب چیزوں سے آپ آنکھیں مراد لے رہے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے اسی مفہوم کی روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

من اذہبت حبیبیہ فصبر و
احتسب لم ارض له ثوابا الا
الجنة^۲
جس شخص کی میں نے دو محبوب چیزیں (آنکھیں) لے لیں۔ اس نے اس پر صبر کیا اور اجر و ثواب طلب کرتا رہا تو جنت کے علاوہ کوئی اور صلہ میں اس کے لیے پسند نہیں کروں گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت کو مرگی کی شکایت تھی، جب اس پر اس کا دورہ پڑتا تو اسے اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ تم چاہو تو میں دعا کروں (امید ہے اللہ تعالیٰ شفا دے گا) چاہو تو صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ اس کے عوض جنت عطا فرمائے گا۔ اس نے کہا تب تو صبر ہی کروں گی۔ البتہ آپ دعا فرمائیے کہ دورہ کی حالت میں میری بے ستری نہ ہو۔ آپ نے اس کی دعا فرمائی۔^۳

اس عورت نے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے اس کی درخواست رد تو نہیں کی

۱ بخاری، کتاب المرضی، باب فضل من ذہب بصرہ

۲ ترمذی، ابواب الزہد، باب ماجاء فی ذہاب البصر

۳ بخاری، کتاب المرضی، باب فضل من یصرع من الريح۔ مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المؤمن فیما یصیبه

لیکن صبر کی فضیلت بیان کی اور اس کی تلقین فرمائی۔ ہو سکتا ہے اسی کو آپ نے اس کے حق میں بہتر سمجھا ہو، لیکن اس کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس میں دعا کی ممانعت نہیں ہے۔ ایک معذور اس بات کی دعا کر بھی سکتا ہے اور کرا بھی سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معذوری سے نجات دے بلکہ اسے عافیت کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔ البتہ یہ بات ہمیشہ ذہن میں تازہ رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی اور اسے وہ اس کے حق میں مفید سمجھے گا تو دعا قبول ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔ اسے ہر حال میں اللہ کے فیصلہ پر راضی اور مطمئن ہونا چاہیے اور کبھی صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ احادیث میں صبر کی تلقین کے ساتھ دعا کا بھی ثبوت ہے۔

حضرت عثمان بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی، دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ بینائی عطا کرے اور عافیت دے۔ آپ نے فرمایا کہ تم چاہو تو میں دعا کر سکتا ہوں لیکن صبر کرو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ لیکن اس نے دوبارہ دعا ہی کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا تم اچھی طرح وضو کر کے یہ دعا کرو:

اللهم انی اسألك و اتوجه
الیك بنبيك محمد نبی
الرحمة انی توجهت بك الی
ربی ليقضى لی فی حاجتی
اللهم فشفعه فیّ

اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور
تیرے نبی محمدؐ کے واسطے سے جو نبی رحمت
ہیں متوجہ ہوتا ہوں، میں نے آپ کے
ذریعے اپنے رب کی طرف رجوع کیا ہے
تاکہ وہ میری حاجت پوری کرے۔ اے اللہ
میرے سلسلہ میں ان کی شفاعت قبول فرما۔

معذور کو اپنی محرومی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس پر مایوسی طاری رہتی ہے اور وہ حالات کے مقابلہ کی اپنے اندر تاب نہیں پاتا۔ اس وجہ سے صبر کی اس کے لیے بڑی اہمیت ہے۔ اس سے اسے تسلی و تشفی اور ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے کہ آج گو وہ ایک نعمت سے محروم ہے، لیکن کل خدا کے یہاں اس کا بہترین صلہ اسے ملنے والا ہے۔ صبر اسے

جزع فزع اور شکوہ شکایت سے روکتا ہے۔ ایک مومن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ راضی بہ رضائے الہی رہتا ہے۔ یہ خوبی زندگی کے ہر نازک مرحلہ میں کام آتی اور اسے ثابت قدم رکھتی ہے۔ صبر یہ نہیں ہے کہ آدمی بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنا رہے، بلکہ صبر استقامت اور پامردی کا نام ہے۔ صبر کا وصف ایک معذور شخص کے اندر بھی یہ حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ ہمت ہار کر بیٹھ نہ جائے بلکہ حالات کا مقابلہ کرے اور کش مکش حیات میں اپنا حصہ ادا کرے۔

ذمہ داریوں میں تخفیف

معذور کو یہ احساس پریشان کر سکتا ہے اور کرتا ہے کہ وہ خدا کے دین کی خدمت اس طرح نہیں کر پارہا ہے جس طرح دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ اسلام نے اسے اطمینان دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک پر اس کی طاقت کے لحاظ سے بوجھ ڈالا ہے۔ اس پر ان بہت سے کاموں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جو صحیح سالم اور تندرست انسانوں پر عائد ہوتی ہے۔ جہاد کی اسلام میں بڑی فضیلت ہے۔ بعض اوقات اسلامی ریاست اسے اپنے ہر شہری پر فرض بھی قرار دے سکتی ہے۔ اس صورت میں کسی کا اس سے پیچھے رہ جانا بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن معذور بہر حال اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ چنانچہ احکام جہاد کے ذیل میں ارشاد ہوا:

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرْجٌ وَلَا
عَلَى الْأَعْرَجِ حَرْجٌ وَلَا عَلَى
الْمَرِيضِ حَرْجٌ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَنْ يَتَوَلَّ
يُعَذِّبْهُ عَذَابًا عَظِيمًا (الفتح: ۱۷)

نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے، نہ لنگڑے پر کوئی
گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے (اگر
وہ جہاد میں شرکت نہ کریں) اور جو شخص اللہ
اور رسول کی اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے
جنتوں میں داخل فرمائے گا، جن کے نیچے
نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو شخص روگردانی
کرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا۔

ایک جگہ قرآن نے کہا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور جہاد نہ کرنے

والے ایک نہیں ہو سکتے۔ جہاد کرنے والوں کے بڑے درجات ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس کلیہ سے معذور مستثنیٰ ہیں۔ ارشاد ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقُعْدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ
غَيْرُ أُولَى الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ
فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقُعْدِينَ دَرَجَةً
وَكَأَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ وَفَضَّلَ
اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقُعْدِينَ
أَجْرًا عَظِيمًا ۝ دَرَجَتٍ مِنْهُ وَ
مَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللَّهُ
غَفُورًا رَحِيمًا (النساء: ۹۵-۹۶)

ایمان والوں میں سے وہ لوگ جو کسی عذر
کے بغیر جہاد سے بیٹھ رہیں اور وہ جو اللہ کے
راستے میں اپنے جان و مال سے جہاد کریں،
برابر نہیں ہیں۔ اپنے مال اور جان سے جہاد
کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بیٹھ رہنے
والوں کے مقابلہ میں بڑا اونچا درجہ عطا کیا
ہے۔ گوہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ
کیا ہے۔ لیکن اس نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے
والوں کے مقابلہ میں اجر عظیم سے نوازا ہے۔
یعنی اس کی طرف سے بڑے درجات اور
مغفرت و رحمت اور اللہ غفور رحیم ہے۔

ان آیتوں میں معذوروں کو الگ کر کے غیر معذور اور صحت مند افراد کے
درمیان موازنہ کیا گیا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر کسی کے اندر خلوص کے ساتھ خدا
کی راہ میں جان و مال لٹانے کا جذبہ ہے اور وہ محض اپنی مجبوری اور معذوری کی وجہ سے
اس میں حصہ نہیں لے رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی مجاہدین کا ثواب عطا فرمائے گا۔
احادیث میں یہ بات کھول دی گئی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ
نے ایک غزوہ میں فرمایا:

ان اقواما خلفنا ما سلکنا
شعبا ولا وادیا الا وهم معنا
حبسهم العذر

بے شک ہمارے پیچھے کچھ لوگ رہ گئے ہیں
ہم جس گھاٹی اور وادی میں بھی چلیں وہ اپنی
نیت اور ارادہ کی وجہ سے ہمارے ساتھ
ہیں۔ ان کو معذوری نے روک رکھا ہے۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے:

لقد ترکتم بالمدينة اقواما ما
سرتم مسيرا ولا انفقتم من
نفقة ولا قطعتم من واد الا وهم
معکم فيه قالوا و کیف یکنون
معنا وهم بالمدينة قال حبسهم
العذر^۱

تم نے مدینہ میں کچھ لوگوں کو چھوڑا ہے کہ تم
تھوڑا یا بہت جو چلتے ہو یا خرچ کرتے ہو یا
کوئی وادی طے کرتے ہو، وہ تمہارے ہی
ساتھ ہوتے ہیں۔ صحابہ نے کہا کہ وہ مدینہ
میں رہتے ہوئے ہمارے ساتھ کیسے ہو سکتے
ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کو
ارادہ کے باوجود عذر نے روک رکھا ہے۔

بیماری اور سفر کی سہولت کا نہ ہونا بھی عذر ہے لیکن اس میں جسمانی معذوری
بدرجہ اولیٰ شامل ہے۔ اوپر جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں اسی کا ذکر ہے۔ یہ
حدیثیں اپنے عام الفاظ میں اس کی تائید کرتی ہیں۔

نماز باجماعت کی بڑی فضیلت ہے۔ اسے سنت موکدہ بلکہ واجب کہا گیا ہے۔
بعض لوگوں نے جہاد سے متعلق آیات سے یہ استدلال کیا ہے کہ معذور کے لیے
جماعت کی شرکت ضروری نہیں ہے۔ ایک حدیث میں اس کی صراحت بھی موجود ہے۔
حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من سمع النداء فلم یات
الصلوة فلا صلوة الا من عذر^۲

جو اذان سنے اور جماعت میں شرکت کے
لیے نہ آئے تو اس کی نماز نہ ہوگی الا یہ کہ
اسے کوئی عذر ہو اور اس وجہ سے وہ نہ پہنچے۔

یہاں دو مثالیں دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی
ہیں جن میں شریعت نے معذوروں کو احکام شریعت سے یا تو مستثنیٰ قرار دیا ہے یا ان
کے ساتھ رعایت اور تخفیف کی ہے۔

۱۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب الرخصة فی القعود من العذر

۲۔ رواہ ابن ماجہ والدارقطنی وابن حبان والحاکم

صلاحیتوں کا اعتراف

بعض افراد کسی نہ کسی جسمانی نقص میں مبتلا ہونے کے باوجود بہت سی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر ان کی ہمت افزائی ہو اور ان کے لیے مواقع فراہم کیے جائیں تو وہ باعزت زندگی گزار سکتے ہیں اور معاشرے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ اسلام کسی بھی معذور کے اندر موجود خوبیوں اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنی معذوری کے باوجود وہ کوئی خدمت انجام دے تو اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ موجودہ دور میں دینی خدمات بڑی حد تک اپنی قدر و قیمت کھو چکی ہیں۔ اس لیے اذان اور امامت جیسے کاموں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان مناصب کے لیے معاشی اور معاشرتی لحاظ سے فروتر افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے، حالاں کہ اسلام کے نزدیک ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے لیے ذی صلاحیت اور اصحاب تقویٰ کے انتخاب کا حکم ہے۔ دورِ اول میں اسی پر عمل تھا۔ اس پس منظر میں یہ دیکھئے کہ عہدِ رسالت میں امامت اور مؤذنی کے فرائض کون انجام دے رہا ہے۔ جب تک آپ بقید حیات تھے خود ہی امامت فرماتے تھے۔ البتہ دو مؤذن آپ نے مقرر فرمائے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت بلالؓ اور دوسرے عمرو بن ام مکتومؓ تھے۔^۱

حضرت بلالؓ آزاد کردہ غلام اور حضرت عمرو بن ام مکتومؓ نابینا تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام غلاموں اور معذوروں کو کیا مقام دیتا ہے اور ان کی اس نے کس قدر عزت افزائی کی ہے؟ اس سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو عمرو بن ام مکتومؓ کو امامت کے لیے اپنا نائب اور جانشین مقرر فرمایا۔^۲

یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ مکہ سے ہجرت کر کے

۱۔ مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب جواز اذان الاعمی

۲۔ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ الاعمی

سب سے پہلے مصعب بن عمیرؓ ہمارے پاس مدینہ پہنچے۔ ان کے بعد عمرو ابن ام مکتومؓ آئے۔ رسول اللہ ﷺ بیشتر غزوات میں انھیں اپنا نائب مقرر فرماتے تھے اور وہ مدینہ میں امامت کیا کرتے تھے۔^۱

علامہ ابن عبد البر واقدی کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں تیرہ غزوات میں مدینہ منورہ میں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔^۲

عتبان بن مالک انصاریؓ ان صحابہ میں ہیں جو جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی خراب ہو گئی تھی لیکن اپنے قبیلہ کی امامت وہی فرماتے تھے۔^۳

عمیر بن عدی بن خرشہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ نابینا تھے لیکن اپنے قبیلہ میں سب سے پہلے اسلام لائے قرآن شریف بھی تھوڑا سا حفظ تھا اس وجہ سے قاری کہلاتے تھے۔ اپنے قبیلہ کی امامت وہی فرماتے تھے۔^۴

معذور دوہرے اجر کا مستحق ہے

اسلام کا تصور یہ ہے کہ معذور اپنی معذوری کے باوجود کوئی دینی کام انجام دیتا ہے تو اس کا اجر و ثواب بھی خدا کے نزدیک زیادہ ہے۔ اس لیے کہ اسے زیادہ محنت و مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث روایت کرتی ہیں:

۱۔ ابن حجر، الاصابة فی تمییز الصحابة: ۴/۴۹۵

۲۔ ابن عبد البر، الاستيعاب فی اسماء الاصحاب: ۳/۲۷۶

۳۔ بخاری، کتاب الحکمة باب المساجد فی البيوت۔ مسلم، کتاب المساجد،

باب الرخصة عن التخلف عن الجماعة

۴۔ الاصابة: ۴/۵۹۹۔ الاستيعاب: ۳/۲۹۱

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق

قرآن میں مہارت رکھنے والا ان (فرشتوں) کے ساتھ ہوگا جو اللہ کی کتابوں کے لکھنے والے اور بہت ہی نیک ہیں، جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں رکاوٹ محسوس کرتا ہے اس وجہ سے قرآن کا سیکھنا اور پڑھنا اس پر دشوار ہے تو اس کو دو گنا اجر ملے گا۔

الماهر بالقرآن مع السفارة
الکرام البررة والذى يقرء
القرآن و يتتبع فيه وهو عليه
شاق له اجران^۱

اس حدیث میں ایک طرف تو قرآن کے ماہر کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ اسے ان بزرگ و برتر ملائکہ کی معیت نصیب ہوگی، جو حامل قرآن ہیں اور جن کے ہاتھوں میں یہ پاک صحیفہ ہے۔ دوسری طرف اس شخص کی ہمت افزائی کی گئی ہے جسے اس طرح کی مہارت حاصل نہیں ہے اور جو زبان میں لکنت کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس کی صلاحیت ہی کم ہے، قرآن روانی سے نہیں پڑھ پانا لیکن اس کے باوجود اپنی سی کوشش کر رہا ہے اور محنت و مشقت سے قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ اس کا اجر عام قاری کے مقابلے میں دو گنا ہوگا۔ تلاوت قرآن کے بارے میں یہاں جو بات کہی گئی ہے اسی پر ان تمام عبادات اور دینی کاموں کو قیاس کیا جاسکتا ہے، جنہیں ایک معذور زحمت کے باوجود انجام دیتا ہے۔

اس طرح اسلام نے بیماروں اور معذوروں کے اندر ایک نئی طاقت اور توانائی پیدا کر دی اور انھوں نے بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ دینی خدمات انجام دیں۔ نماز باجماعت کے سلسلے میں صحابہ کرام کے ذوق و شوق اور جذبے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

ان کان المریض لیمشی بین
رجلین حتی یاتی الصلوۃ^۲
بے شک مریض (بھی) دو آدمیوں کے
درمیان (سہارے سے) چل کر نماز میں
پہنچتا تھا۔

۱۔ مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضیلة حافظ القرآن و رواہ البخاری بمعناه

۲۔ مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلوۃ الجماعة الخ

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

لقد كان الرجل يوتى بها
يهادى بين الرجلين حتى يقام
فى الصف^۱
آدمی کو دو آدمیوں کے بیچ میں (سہارا دے
کر) لایا جاتا اور صف میں کھڑا کیا جاتا۔

عمر و ابن ام مکتومؓ کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ بینائی نہ ہونے کے باوجود وہ
جنگ قادسیہ میں شریک تھے۔ اسی جنگ میں شہادت پائی۔^۲

معاشرے کی ذمہ داری

اسلام نے جہاں معذوروں کے اندر خود اعتمادی، عزم و ہمت اور استقامت
پیدا کی وہیں معاشرے کو بھی ان کے سلسلے کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور کہا کہ ان
ذمہ داریوں کو ادا کر کے تم اپنا فرض انجام دیتے ہو کسی پر احسان نہیں کرتے ہو۔

عزت کا مقام دیا جائے

عام طور پر معذوروں کو سوسائٹی میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسلام
کی تعلیم یہ ہے کہ انھیں فروتر نہ سمجھا جائے اور عزت کی جگہ دی جائے۔ چنانچہ مکہ کے
ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ بعض سردارانِ قریش سے اسلام پر بات چیت
فرما رہے تھے کہ اسی اثنا میں عمرو بن ام مکتومؓ پہنچ گئے۔ ان کی اچانک آمد آپ کو اس
خیال سے ناگوار گزری کہ یہ متکبرین عرب ایک نابینا کے ساتھ کسی مجلس میں نہیں بیٹھ
سکتے تھے۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح ان کو خدا کا پیغام سنائیں، اس لیے کہ
اگر ان کے دل اس کے لیے کھل گئے اور انھوں نے اسے قبول کر لیا تو دوسروں کو بھی
ترغیب ہوگی اور وہ بھی اس کی طرف آگے بڑھیں گے۔ قرآن مجید نے ان سرکشوں کے
پیچھے اس طرح پڑنے سے منع کیا اور کہا کہ حق کو قبول کرنے میں ان ہی کا فائدہ ہے۔

۱۔ مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلوٰۃ الجماعة الخ

۲۔ ابن عبد البر، الاستیعاب: ۲۷۶/۳

اگر نہیں قبول کرتے ہیں تو تمہارا کوئی نقصان نہیں، سراسر ان ہی کا نقصان ہے۔ ان سرکشوں کی خاطر اللہ کے ان بندوں کی طرف تمہاری توجہ کم نہ ہو، جن کے دل خدا کے خوف سے بھرے ہوئے ہیں:

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا اس پر کہ ایک اندھا اس کے پاس آیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شاید وہ تزکیہ چاہتا ہو۔ یا نصیحت حاصل کرنا چاہتا ہو اور نصیحت اس کے لیے مفید ہو، لیکن جو بے پروائی کرتا ہے تم اس کے پیچھے پڑے ہو۔ اگر وہ تزکیہ نہ حاصل کرے تو تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ لیکن جو تمہارے پاس دوڑ کر آ رہا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے تو تم اس سے غفلت برتتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۖ اَنْ جَاءَهُ
الْاَعْمٰی ۖ وَمَا يُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ
یَزْكٰی ۖ اَوْ یَذْكُرُ فِتْنَعَهٗ
الذِّكْرِی ۖ اَمَّا مِنْۢ مُّسْتَعْنٰی ۖ
فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدِّی ۖ وَمَا عَلٰیكَ
اَلَّا یَزْكٰی ۖ وَاَمَّا مَنْ جَاءَكَ
یَسْعٰی ۖ وَهُوَ یَخْشٰی ۖ فَاَنْتَ
عَنْهُ تَلَهٰی ۚ كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۖ
فَمَنْ شَاءَ ذَكِّرْهُ ۖ (عبس: ۱-۱۲)

اس طرح اسلام نے یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا معیار ظاہری وجاہت، صحت و تندرستی اور دولت و ثروت نہیں ہے بلکہ تقویٰ و طہارت اور اخلاق و کردار ہے۔ وہ اندھا شخص جس کے اندر حق کی طلب ہے اور جو اپنی اصلاح اور تزکیہ چاہتا ہے وہ ان خوب صورت آنکھوں والوں سے ارفع و اعلیٰ ہے جن کے دل پتھر بن چکے ہیں اور جو اپنی دولت و سطوت کے غرور میں خدا کی ہدایت سے اپنے کو بے نیاز سمجھ رہے ہیں۔ ان سرکشوں اور جباروں کی خاطر خدا کے ان معذور بندوں سے بے رخی برتنا صحیح نہیں ہے۔

معذور کے اندر بالعموم احساس کم تری بھی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے ملنے جلنے کھانے پینے اور معاشرتی تعلق رکھنے میں تکلف برتا ہے۔ اسلام نے اس احساس کم تری کو دور کیا ہے۔ اس لیے کہ جب تک یہ احساس باقی ہے وہ اپنے آپ کو فروتر ہی سمجھے

اور تندرستوں اور صحت مند لوگوں کی صف میں بیٹھنے سے احتراز کرے گا۔ چنانچہ ایک جگہ معاشرتی احکام کے ذیل میں فرمایا:

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا
عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى
الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى
أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوتِكُمْ

نہ تو اندھے کے لیے کوئی حرج ہے اور نہ
لنگڑے کے لیے حرج ہے اور نہ مریض کے
لیے کوئی حرج ہے اور نہ خود تمہارے لیے
حرج ہے کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ۔

(النور: ۶۱)

مطلب یہ کہ معذوروں اور مریضوں کو عزیزوں، رشتہ داروں اور دوست احباب کے ہاں آنے جانے اور کھانے پینے کی پوری اجازت ہے۔ جب اسلام نے اس پر پابندی نہیں لگائی ہے تو وہ بھی کسی قسم کی پابندی محسوس کریں۔ وہ معاشرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ ہیں اور سب سے برابر کے تعلقات رکھ سکتے ہیں۔

بعض لوگ مریضوں اور معذوروں کے ساتھ ملنے جلنے اور کھانے پینے میں انقباض اور کراہت محسوس کرتے ہیں۔ اس میں ان پر بھی تنقید ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی آمد و رفت کسی کے لیے بارِ خاطر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ان کا حق ہے اور تمہارا فرض ہے کہ ان کی خدمت کرو نہ یہ کہ ان سے نفرت کرو اور دور بھاگو۔

حسن سلوک کیا جائے

اسلام نے معاشرے کو معذوروں، کم زوروں اور مجبوروں کی مدد اور تعاون پر ابھارا ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ ان کی مدد کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک مالی مدد بھی ہے۔ مالی مدد کی اہمیت بالعموم محسوس بھی کی جاتی ہے اور اسی کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے لیکن مدد کی دوسری شکلیں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام نے مالی اور غیر مالی ہر طرح کی مدد کی ترغیب دی ہے۔ اس کے نزدیک خدا کے بندوں پر جس طرح مال خرچ کرنا صدقہ ہے اسی طرح

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق

اپنی صلاحیت اور توانائی کا صرف کرنا بھی صدقہ ہے۔ آدمی اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل اور عبادت ہی سے نہیں بلکہ اپنے اخلاق و کردار، خدمت خلق، کم زوروں اور معذوروں کی غمخواری و خیر خواہی اور معاشرہ میں نیکی اور بھلائی کو عام کر کے اور لوگوں کو بدی اور معصیت سے باز رکھ کر بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توانائی اور قوت و صلاحیت کا حق ادا کرتا ہے۔

حضرت ابو ذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا بھی صدقہ ہے۔ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا بھی صدقہ ہے۔ کسی بھٹکنے والے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے۔ کسی اندھے آدمی کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ راستہ سے ہڈی، کانٹا اور پتھر کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے بھائی کے ڈول میں ڈول سے پانی بھر دینا بھی صدقہ ہے۔^۱

اس سے زیادہ تفصیل ایک دوسری روایت میں آئی ہے۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو انسان پر اپنے نفس کی طرف سے صدقہ واجب ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تو مال نہیں ہے کہ ہر روز صدقہ کیا جائے۔ آپ نے فرمایا صدقہ کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ان ہی میں سے اللہ اکبر، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، استغفر اللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ معروف کا حکم دو، منکر سے روکو۔ راستے سے کانٹا، ہڈی اور پتھر ہٹادو، کسی اندھے کو راہ دکھا دو، گونگے اور بہرے کو بات سمجھا دو۔ کسی حاجت مند کو اس جگہ کی نشان دہی کر دو جہاں سے تمہارے خیال میں اس کی مدد ہو سکتی ہے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرو اور کم زور کی مدد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ سب صدقے کی صورتیں ہیں۔^۲

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف

۲۔ مسند احمد: ۱۶۹/۵

من قاد مكفوفا اربعين خطوة
غفرله ما تقدم من ذنبه و
ما تاخره
جو شخص چالیس قدم کسی نابینا کی رہنمائی
کرے تو اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف
کردیے جائیں گے۔

دل جوئی کی جائے

معذور کے لیے اس کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ اس کی دل جوئی کی جائے۔ اس کے ساتھ ہمدردی و غم خواری کا اظہار کیا جائے اور اس کے جذبات کا احترام کیا جائے۔ اس سے اس تسلی و تشفی اور راحت ملتی ہے اور بے گانگی اور اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں رسول اکرم ﷺ کے حسن خلق اور کردار کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

اس سے پہلے حضرت عتبہ بن مالکؓ کا ذکر آچکا ہے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی خراب ہو گئی تھی، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ بارش کے دنوں میں، میں مسجد نہیں پہنچ سکتا۔ آپ میرے گھر کسی جگہ نماز ادا فرمادیں تاکہ میں وہیں نماز ادا کیا کروں۔ آپ نے فرمایا۔ بہت اچھا۔ انشاء اللہ ہم ضرور آئیں گے۔ فرماتے ہیں کہ دوسرے روز دن چڑھنے کے بعد آپ حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ تشریف لائے۔ دریافت فرمایا، کس جگہ چاہتے ہو کہ میں نماز پڑھوں۔ میں نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے دو رکعت نماز پڑھی۔ ہم نے بھی آپ کے پیچھے نماز ادا کی اور سلام پھیرا۔ پھر ہم نے خزیر (جو گوشت اور آٹے سے بنایا جاتا تھا) کھلانے کے لیے آپ کو (تھوڑی دیر) روک لیا۔^۱

۱۔ علامہ سیوطی نے طبرانی، ابو نعیم اور بیہقی وغیرہ کے حوالہ سے اس مضمون کی ایک سے زیادہ روایات نقل کی ہیں۔ لیکن ان میں ضعف ہے۔ التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/۴۳۳ یہاں الفاظ حدیث حافظ ابن حجر کے رسالہ 'انحصال المفرد' سے لیے گئے ہیں۔ الرسائل المنیریہ: ۱/۲۶۳

۲۔ بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب المساجد فی البیوت۔ مسلم کتاب المساجد، باب الرخصة عن التخلف من الجماعة

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق

حضرت جبیر بن مطعمؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ محلہ واقف چلو، تاکہ بصیر سے ملاقات کر آئیں۔ بصیر ایک نابینا شخص تھا۔^۱
ابن السکن کہتے ہیں کہ ان کا نام عمیر بن عدی تھا۔ رسول اللہ ﷺ ان کی ملاقات کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔^۲

بدسلوکی نہ کی جائے

ایک طرف اسلام نے معذوروں کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت بیان کی اور اس کی ترغیب دی۔ دوسری طرف ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے اور انھیں پریشان کرنے سے منع فرمایا اور اسے خدا کی لعنت کا سبب قرار دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لعن اللہ من کمہ الاعمی عن اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جس نے السبیل^۳ اندھے کو راستے سے بھٹکایا۔

پاگل غیر مکلف ہے

جسمانی معذوری سے زیادہ سنگین، تکلیف دہ اور عبرت ناک، مانگی معذوری ہے۔ اس کے بھی مختلف درجات ہیں۔ اس کی انتہائی شکل جنون اور پاگل پن ہے، جس میں انسان ہوش و خرد کھو بیٹھتا ہے اور اسے اپنے عمل اور اس کے نتائج کا شعور باقی نہیں رہتا۔ عقل اور ہوش ہی کی وجہ سے انسان کسی بھی عمل کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے بھی اسے تمام شرعی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ قال المنذری رواہ البزار باسناد جید (الترغیب و الترهیب: ۲۴۸/۳)

۲۔ الاصابة فی تمییز الصحابة: ۵۹۹/۴

۳۔ مسند احمد: ۳۰۹/۱۔ الادب المفرد: ۳۳۸/۲

تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے (ان کی کوئی گرفت نہیں ہوگی) مجنون سے جب تک کہ اس کی عقل بحال نہ ہو جائے۔ بچہ سے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے۔ سونے والے سے جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے۔

ان القلم رفع عن ثلاثة عن
المجنون حتى يفيق و عن
الصبي حتى يدرک و عن
النائم حتى يستيقظ^۱

پاگل سے متعلق بعض احکام

ہمارے فقہانے مجنون کے سلسلے میں حسب ذیل باتیں لکھی ہیں:

۱- مجنون پر کوئی شرعی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جو فرائض و واجبات مقرر کیے ہیں، ان کے ادا نہ کرنے پر اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔

۲- اس سے کسی معصیت اور نافرمانی کا صدور ہو جائے تو اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

۳- مجنون کے تصرفات ناقابل اعتبار ہیں۔ یعنی اگر وہ لین دین کرے، ہبہ کرے یا نکاح، طلاق وغیرہ کے سلسلے میں کوئی اقدام کرے تو یہ اقدام غیر موثر ہوگا۔ اسے نافذ نہیں کیا جائے گا۔

۴- اس سے قابل تعزیر جرم سرزد ہو تو اسے سزا نہیں دی جائے گی۔

۵- البتہ اگر اس کی وجہ سے کسی کا جانی یا مالی نقصان ہو تو اس کا تاوان ادا کیا جائے گا۔^۲

۱ بخاری، کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق الخ۔ ابوداؤد، کتاب الحدود، باب فی المجنون یسرق او یصیب حدا۔ بخاری میں یہ روایت موقوف ہے اور ابوداؤد میں مرفوع آئی ہے۔ ابوداؤد میں اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت عائشہؓ سے بھی مروی ہے۔

۲ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہدایۃ کتاب الحجر: ۳/۳۲۹-۳۵۱ اور دیگر کتب فقہ

اس طرح اسلام نے ایک طرف پاگل کو آخرت کے حساب کتاب سے بری قرار دیا ہے اور دوسری طرف اس کے مفادات کا تحفظ کیا ہے تاکہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہو اور کوئی اس کی معذوری سے غلط فائدہ نہ اٹھانے پائے۔

کم زور عقل والوں کی رعایت

بعض لوگ مجنوں اور پاگل تو نہیں ہوتے۔ البتہ شدید دماغی کم زوری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان میں معاملہ فہمی کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ اچھے برے کی تمیز نہیں کر سکتے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کسی بھی معاملہ میں ان کو دھوکا نہ دیا جائے۔ لیکن دین میں ان کے ساتھ رعایت کی جائے اور بہتر سے بہتر سلوک کیا جائے۔

ایک انصاری اسی طرح کی دماغی کم زوری میں مبتلا تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ کاروبار کیے بغیر رہا نہیں جاتا اور کاروبار کرتا ہوں تو دھوکا کھا جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا جب کسی سے معاملہ کرو تو لاخلابة (ہمارے دین میں دھوکا دہی نہیں ہے) کہہ دیا کرو۔ چناں چہ وہ جب بھی معاملہ کرتے تو لاخلابة کہہ دیا کرتے تھے۔^۱

یہ حدیث آج کے معاشرے اور اسلامی معاشرے کے فرق کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ آج اگر کسی کی کم زوری اور معذوری کا علم ہو جائے تو اس کے استحصال کی کوشش کی جائے گی لیکن اسلامی معاشرے میں اگر کسی کو اس بات کا علم ہو جاتا کہ فلاں شخص معذور ہے تو اسے محبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا زیادہ مستحق سمجھتا۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اسے زیادہ سے زیادہ نفع پہچاننے کی کوشش کرتا۔ اس لیے ایک اسلامی معاشرے میں کسی کا 'لاخلابة' کہہ دینا اس بات کو اور زیادہ یقینی بنا دیتا تھا کہ اس کو دھوکا ہرگز نہیں دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ممکنہ رعایت کی جائے گی، جس سادگی

۱۔ بخاری، کتاب البیوع، باب ما یکرہ من الخداع۔ مسلم، کتاب البیوع

اور سادہ لوحی پر آج انسان بازار میں لٹ جائے، اسلامی معاشرے میں وہی اسے ہر ضرر سے محفوظ رکھتی تھی۔

معذور کی کفالت

جو شخص اندھا، لولا، لنگڑا، اپاہج یا عقلی طور پر معذور ہونے کی وجہ سے کمانے کے قابل نہ ہو تو اسلامی قانون کی رو سے سب سے پہلے اس کا باپ اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ باپ نہ ہو تو قریبی رشتہ داروں پر اس کے معاش کی ذمہ داری عائد ہوگی۔^۱ قریبی رشتہ دار نہ ہوں یا وہ اس کا معاشی بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہوں تو اسلامی ریاست یہ بوجھ اٹھائے گی اور اس کی کفالت کرے گی۔

اسلامی ریاست اس کا نان نفقہ ہی نہیں دوسری ضروریات بھی پوری کرنے کی کوشش کرے گی۔ سعید بن یزیدؒ ایک قریشی صحابی تھے۔ ان کی بینائی کسی وجہ سے ختم ہوگئی تو حضرت عمرؓ مزاج پرسی اور عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اسی کے ساتھ فرمایا کہ آپ نماز باجماعت اور جمعہ ترک نہ کیجئے۔ انھوں نے کہا: مسجد تک پہنچانے والا کوئی نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہم اس کا انتظام کر دیں گے۔ آپ کے پاس اس وقت غلام تھے تو ایک لڑکا ان کے لیے بھیج دیا۔^۲

جب اسلامی ریاست ایک نابینا کی نماز باجماعت اور جمعہ میں شرکت کا انتظام کر سکتی ہے تو اس کی بنیادی ضرورتوں کو بدرجہ اولیٰ پورا کرے گی۔

۱۔ ملاحظہ ہو: ہدایہ مع فتح القدیر: ۳/۳۲۳

۲۔ الاصابة فی تمییز الصحابة: ۳/۹۸۔ کنز العمال: ۸/۱۹۸

دفاع کا حق

دفاع کا حق

دنیا کا کوئی بھی فرد کسی دوسرے پر کسی قسم کی دست درازی کرے تو اسے دفاع کا حق ہے۔ اسے نہ تو کوئی معقول شخص غلط کہہ سکتا ہے اور نہ کسی ریاست نے اس کا انکار کیا ہے۔ یہ سب ہی کے نزدیک ایک تسلیم شدہ حق ہے۔ اس حق سے کسی کو محروم کرنا ظلم کو تقویت پہنچانا ہے۔ جب بھی کسی نے ظلم کے سامنے خود سے گھٹنے ٹیک دیے یا اسے اس پر مجبور کیا گیا تو تاریخ بتاتی ہے کہ ظالم کے حوصلے بڑھے اور ظلم میں اضافہ ہوا۔ یہ سب کچھ آج بھی ہو رہا ہے۔ اس کا بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے خود مظلوم کی نفسیات بدل جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ظلم سہنا اور جور و ستم برداشت کرنا اس کا مقدر ہے۔ وہ بعض اوقات یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا کہ ظلم و زیادتی کا جواب دینے کا بھی اسے حق حاصل ہے۔ وہ اس سے زیادہ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور سمجھنے لگتا ہے جتنا فی الواقع بے بس اور مجبور نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو خود اس کی بزدلی اور نامردی ہی اسے مظلومی کے مقام پر پہنچا دیتی ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ دفاع ایک نازک عمل ہے۔ اس میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات دفاع کے نام پر ظلم و زیادتی اور ناحق کشت و خون ہونے لگتا ہے اور اس کے متعینہ حدود و قیود کا پاس و لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ جب یہ عمل اسلام کے نام پر ہوتا ہے تو اسے دنیا ظلم، تشدد اور دہشت گردی قرار دے کر اسلام ہی کو بدنام کرنے لگتی

ہے اور دفاع کا جائز حق بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اسلام نے، اس میں شک نہیں، دفاع کا حق ہر شخص کو دیا ہے، لیکن ظلم کی قطعاً اجازت نہیں دی ہے۔ اس کی تعلیم ہے کہ انسان نہ تو خود کسی پر ہاتھ اٹھائے اور نہ کسی دوسرے کو اپنے اوپر دست درازی کی اجازت دے، ظالم کے سامنے سپر نہ ڈالے بلکہ پامردی سے اس کا مقابلہ کرے۔ وہ اس بزدلی اور دوں ہمتی کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی دست بستہ اپنی جان، مال اور عزت و آبرو سب کچھ دشمن کے حوالہ کر دے اور کوئی مزاحمت نہ کرے، لیکن اس کے لیے اس نے ایسی شرائط اور ایسے حدود و قیود رکھے ہیں جو سراسر عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔ اسلامی شریعت کے ماہرین نے ان کے پیش نظر بڑی باریک بینی سے دفاع کی تفصیلات مرتب کی ہیں۔

دفاع کے معاملہ میں طرح طرح کے شبہات اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس لیے اس پر الگ سے بحث کی جا رہی ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ گفتگو انفرادی اور شخصی دفاع کی ہے۔ ایک ریاست اور دوسری ریاست کے درمیان جنگ زیر بحث نہیں ہے۔ اس کے احکام دوسرے ہیں۔

دفاع میں جان دینا شہادت ہے

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں صاف اور صریح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ انسان اپنے دین و ایمان، جان و مال، مکان، زمین، جایداد، بیوی بچوں اور خویش و اقارب کی حفاظت میں جان بھی دے سکتا ہے اور یہ جان دینا شہادت ہے۔ شہادت وہ رتبہ بلند ہے جو خوش قسمت انسانوں کو ملتا ہے۔

حضرت سعید بن زیدؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں:

جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو

من قتل دونہ مالہ فہو شہید
ومن قتل دون دینہ فہو شہید و
من قتل دون دمہ فہو شہید و

دفاع کا حق

من قتل دونہ اہلہ فہو شہید^۱ اپنے گھر والوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔ اگر کوئی شخص میرا مال چھینے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا: اپنا مال اسے مت دو۔ اس نے کہا اگر وہ مقابلہ پر اتر آئے؟ آپؐ نے فرمایا تم بھی مقابلہ کرو۔ اس نے عرض کیا اگر وہ مجھے مار ڈالے؟ ارشاد فرمایا ”شہادت پاؤ گے“ اس نے کہا اگر میں اسے قتل کر دوں؟ فرمایا ”وہ جہنم میں جائے گا۔“^۲

انسان اپنی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے آخری حد تک کوشش کرے گا۔ وقت ضرورت اس کے لیے پاس پڑوس کی، معاشرہ کی اور حکومت کی مدد بھی حاصل کرے گا۔ چنانچہ نسائی وغیرہ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ اگر کچھ لوگ میرا مال چھیننا چاہیں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا انھیں اللہ کا حوالہ دو اور سمجھاؤ۔ اس نے عرض کیا۔ اس پر بھی اگر وہ نہ مانیں تو کیا کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا آس پاس کے مسلمانوں سے ان کے خلاف مدد طلب کرو۔ اس نے کہا اگر قریب میں کوئی مسلمان نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا حکومت سے مدد لو۔ اس نے عرض کیا اگر حکومت تک میں پہنچ نہ سکوں تو پھر کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا اپنے مال کی حفاظت کے لیے تنہا کھڑے ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ یا تو تمھاری جان چلی جائے اور تمھارا شمار شہیدوں میں ہو جائے یا تمھارا مال محفوظ رہے۔^۳

ان احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ آدمی اپنی جان، مال، عزت و آبرو، بیوی بچوں اور اپنے دین و ایمان کے دفاع کی کوشش میں جان بھی دے سکتا ہے اور یہ جان دینا شہادت ہے۔ یہ دفاع کرنے والے کا انجام ہے۔ اس کے برعکس اگر حملہ آور مارا

^۱ ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء فی من قتل دون ماله فہو شہید۔ نسائی، کتاب المحاربة۔ ابو داؤد، کتاب السنۃ، باب فی قتال اللصوص

^۲ مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من قصد اخذ ماله غیرہ الخ
^۳ نسائی، کتاب المحاربة (تحريم الدم) باب ما یفعل من تعرض لمالہ

جائے تو جہنم کا مستحق ہے۔ یہ جذبہ اگر پیدا ہو جائے تو انسان ظلم کے سامنے کبھی جھک نہیں سکتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ جس شخص کے اندر یہ جذبہ ہو اس پر دست درازی کی کوئی ہمت بھی آسانی سے نہیں کر سکتا۔ علامہ شوکانی اس سلسلہ کی احادیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

و احادیث الباب مصرحة بان
المقتول دون ماله و نفسه و
اهله و دینه شهید و قاتله اذا
قتل فی النار لان الاول محق
والثانی مبطل^۱

اس باب کی احادیث صراحت کرتی ہیں کہ جو
شخص اپنے مال، جان، اہل و عیال اور دین
کی خاطر قتل کیا جائے وہ شہید ہے، اس کا قتل
کرنے والا دوزخ میں جائے گا، اس لیے کہ
پہلا شخص حق پر ہے اور دوسرا باطل پر۔

دفاع ایک قانونی حق ہے

دفاع کا حق اسلام کے نزدیک ہر شخص کا ایک قانونی حق ہے۔ اس سے کوئی
بھی شخص اسے باز نہیں رکھ سکتا۔ فقہاء کا اتفاق ہے کہ دفاع کے سلسلہ میں حملہ آور کا جو
نقصان ہوگا اس کی ذمہ داری دفاع کرنے والے پر عائد نہ ہوگی۔ اسے نہ تو کسی قسم کی
سزا دی جائے گی اور نہ کوئی تاوان اسے ادا کرنا پڑے گا۔ محدث ابن بطال کہتے ہیں۔
حدیث میں جب یہ کہا گیا ہے کہ دفاع کرنے والا اگر جان دے دے تو شہید ہے، اس
سے از خود یہ بات نکلتی ہے کہ اگر وہ حملہ آور کو قتل کر دے تو (جس طرح مجاہد سے دیت یا
قصاص نہیں لیا جاتا اسی طرح) اس سے بھی قصاص یا دیت نہیں لی جائے گی۔^۲

۱۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۵/۶

۲۔ ابن حجر، فتح الباری: ۵/۶، لیکن یہ استدلال کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک شہید تو وہ
ہے جو اللہ کے راستہ میں اس کے دشمنوں سے لڑ کر جان دیتا ہے۔ اسے شہادت کا اجر و ثواب بھی
حاصل ہوگا اور شہید کے سلسلہ کے احکام کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ جیسے اسے غسل نہیں دیا جائے گا
وغیرہ۔ ایک شہید وہ ہے جسے شہادت کے ثواب کی بشارت تو دی گئی ہے لیکن دنیوی احکام اس کے
وہ نہیں ہیں جو پہلی قسم کے شہید کے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نووی، شرح مسلم جلد ۱، جز ۲،
ص ۱۴۰) اس لیے دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک دفاع کرنے والے
کے حق کا تعلق ہے اس پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ آگے تصریحات آرہی ہیں۔

اپنی ذات کا دفاع

امام شافعی فرماتے ہیں: کسی کی جان، مال اور بیوی بچوں پر حملہ ہو تو اسے دفاع کا حق ہے۔ اگر اس کے نتیجہ میں حملہ آور قتل ہو جائے تو دفاع کرنے والے پر دیت یا کفارہ واجب نہ ہوگا۔^۱

فقہ حنفی میں ہے کہ اگر کوئی شخص قتل کے ارادے سے کسی پر تلوار اٹھائے اور اسے اپنی جان بچانے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ ہو کہ حملہ آور کو قتل کر دے تو اسے وہ قتل کر سکتا ہے۔ اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ فقہ حنفی میں مزید کہا گیا ہے کہ کسی مسلمان پر تلوار اٹھانا گویا مسلمانوں کی جماعت پر تلوار اٹھانا ہے۔ جس طرح جماعت پر تلوار اٹھانے والے کو قتل کیا جاسکتا ہے اسی طرح فرد پر تلوار اٹھانے والے کو بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔^۲

حملہ آور کوئی فرد ہو تو جس طرح دفاع کا حق ہے اسی طرح کوئی گروہ حملہ کرے تو بھی یہ حق حاصل رہے گا۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

اگر ڈاکو کسی کی جان لینا چاہیں تو وہ ان کا مقابلہ کرے گا، چاہے اسے اپنے دفاع میں انھیں قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس پر سب کا اجماع ہے۔^۳

کیا اپنی ذات کا دفاع واجب ہے؟

کیا یہ محض ایک قانونی حق ہے کہ آدمی اپنے دفاع میں حملہ آور کو قتل بھی کر سکتا ہے یا اس کے لیے ضروری ہے کہ حملہ آور کو قتل کیے بغیر اپنا دفاع نہ کر سکے تو حملہ آور کو قتل کر دے؟ فقہ حنبلی میں اسے ایک حق کہا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ آدمی اپنے اس حق

۱۔ ابن حجر، فتح الباری: ۵/۷۶

۲۔ علاء الدین و ابن عابدین، رد المحتار مع الدر المختار: ۵/۴۸۱

۳۔ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۴/۲۲۲۔ طبع جدید

کو لازماً استعمال کرے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں:

اپنی جان اور مال کے دفاع کا انسان کو حق حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اگر وہ حملہ آور کو مجبوراً قتل بھی کر دے تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا لیکن جان و مال کا دفاع واجب نہیں ہے۔^۱

لیکن امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

اپنی ذات کے دفاع کو واجب بھی کہا گیا ہے اور عدم وجوب کے بھی لوگ قائل ہیں۔ امام احمدؒ سے دونوں ہی رائیں منقول ہیں۔^۲

احناف کے نزدیک جان کا دفاع واجب ہے۔ حملہ آور کو قتل کر کے آدمی اپنی جان بچا سکتا ہو تو اس کا قتل کرنا واجب ہے۔ ورنہ آدمی گناہ گار ہوگا۔^۳

مال کا دفاع

جان کے دفاع کی طرح مال کے دفاع کا بھی شخص کو قانوناً حق حاصل ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک چور کو دیکھا تو تلوار کھینچ لی۔ راوی کا بیان ہے کہ اگر ہم انھیں چھوڑ دیتے اور قتل سے باز نہ رکھتے تو اسے وہ قتل کر ہی ڈالتے۔

حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے پوچھا اگر میرے گھر چور گھس آئے اور اس کے ہاتھ میں لوہا (ہتھیار) ہو تو کیا میں اسے قتل کر دوں؟ انھوں نے جواب دیا ہاں! جس طرح بھی تم اسے قتل کر سکو کر دو۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں اگر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تمھاری جان یا تمھارا مال لینا چاہے تو تم اپنی جان اور مال کی حفاظت میں اس سے قتال کرو۔

۱۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۲/۵۳۳-۵۳۴

۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۴/۲۴۲

۳۔ الکفایہ علی الہدایہ: ۵/۱۲۶۴

دفاع کا حق

حضرت ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میرے علم میں فرقہ حروریہ کے لوگوں اور ڈاکوؤں سے قتال کو کسی نے گناہ سمجھ کر نہیں چھوڑا۔ یہ بات اور ہے کوئی شخص بزدلی دکھائے۔

فقہ حنفی میں ہے کہ:

اگر رات میں کوئی شخص کسی کے گھر گھس کر مال و اسباب چرا رہا ہو یا چرانے کا ارادہ کر رہا ہو تو اسے وہ قتل کر سکتا ہے۔ اسی طرح مال و اسباب لے کر اگر وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو اس کا پیچھا کر کے بھی قتل کر سکتا ہے۔ اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔^۱

مال کے دفاع کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ کیا آدمی تھوڑے سے مال کے لیے بھی دفاع کر سکتا ہے یا اس کے لیے مال کی کوئی خاص مقدار ہونی چاہیے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

اگر کوئی شخص ناحق کسی کا مال لینا چاہے تو اسے وہ قتل (بھی) کر سکتا ہے۔ چاہے مال تھوڑا ہو یا زیادہ، اس لیے کہ احادیث میں اس طرح کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ الفاظ عام ہیں۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔ امام مالک کے بعض تلامذہ نے کہا ہے مال اگر تھوڑا ہو تو چھیننے والے کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن صحیح بات وہی ہے جو جمہور نے کہی ہے۔^۲

فقہ حنفی میں ایک رائے یہ ہے کہ مال دس درہم یا اس سے زیادہ قیمت کا ہونا چاہیے۔ ایک دوسری رائے میں مال اتنا ہو جس سے نصاب واجب ہو جائے تو آدمی اسے بچانے کے لیے حملہ آور کو وقت ضرورت قتل بھی کر سکتا ہے۔ اس سے کم ہو تو وہ حملہ آور کا مقابلہ تو کر سکتا ہے کہ لیکن اس کی جان لینا صحیح نہیں ہے۔ لیکن احناف کے ہاں

۱۔ ابن قدامہ، ۱۲، المغنی: ۵۳۱/۱۲-۵۳۳

۲۔ جصاص، احکام القرآن: ۴۰/۲۔ مرغینانی، ہدایہ: ۵۶۵/۳، ابن عابدین

رد المحتار: ۴۸۲/۵

۳۔ نووی، شرح مسلم: جلد ۱، جزء ۲، ص ۱۴۰

بھی ترجیح اسی کو حاصل ہے کہ نصاب سے کم مال کے لیے بھی آدمی حملہ آور کا مقابلہ کرنے اور اسے قتل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس لیے کہ احادیث میں اس طرح کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے^۱۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

اگر ڈاکو زبردستی کسی کا مال لینا چاہیں تو ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اسے اپنا تھوڑا سا مال بھی ان کے حوالہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ وہ ان کو جہاں تک ہو سکے آسان طریقے سے بھگانے کی کوشش کرے لیکن دفاع میں ڈاکوؤں میں سے کوئی مارا جائے تو اس کا خون رائیگاں جائے گا۔ صاحب مال سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔^۲

جمہور کی رائے کے حق میں ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ مال کی اہمیت اصلاً افراد کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ایک شخص کے لیے دس درہم کی وہ اہمیت ہو جو دوسرے کے لیے سو درہم کی بھی نہ ہو۔

کیا مال کا دفاع واجب ہے

امام ابن تیمیہ اپنی سابقہ بحث ہی کے ذیل میں فرماتے ہیں:

مال کا دفاع واجب نہیں ہے، اس لیے چاہے تو وہ ڈاکوؤں سے مقابلہ کیے بغیر ہی اپنا مال ان کے حوالہ کر سکتا ہے۔^۳

امام نووی فرماتے ہیں:

مال کا دفاع جائز ہے واجب نہیں ہے۔^۴

بعض علماء نے مال کے دفاع کو واجب قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

۱۔ ابن عابدین، رد المحتار: ۵/۲۸۲

۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۴/۲۴۳

۳۔ حوالہ سابق

۴۔ نووی، شرح مسلم، جلد ۱، جزء ۲، ص ۱۴۱

دفاع کا حق

مال کے دفاع میں اگر حملہ آور سے مقابلہ کرنا پڑے تو اسے لازماً مقابلہ کرنا چاہیے۔ غالباً ان حضرات کا استدلال حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے ہے جس میں حملہ آور کا مقابلہ کرنے اور مال اس کے حوالہ نہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔^۱

خاندان اور بیوی بچوں کا دفاع

انسان کا معاشرے میں قریب ترین تعلق بیوی، بچوں اور خاندان والوں سے ہوتا ہے۔ ان کی بہت سی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں۔ ان پر کوئی نازک وقت آئے تو وہ اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہے اور اپنا مال لٹا سکتا ہے۔ ان کا دفاع اگر قانون کے حدود میں ہو تو اسلام نے اس کی تعریف کی ہے۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے۔

خیرکم المدافع عن عشیرتہ
مالم یأثم^۲
تم میں بہتر آدمی وہ ہے جو اپنے خاندان کا
دفاع کرے۔ جب تک کہ دفاع کے سلسلے
میں وہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ مناویؒ کہتے ہیں:

... فیرد عنہم من ظلمہم فی
مال او عرض او بدن ... مالم
یظلم الدافع فی دفعہ بان تعدی
الحد الواجب فی الدفع^۳
... وہ خاندان والوں کے مال، عزت و آبرو
اور جسم و جان پر حملہ ہو تو اس کا جواب دیتا
اور دفاع کرتا ہے ... دفاع کرنے والا اس
وقت تک قابل تعریف ہے جب تک کہ وہ
اس معاملہ میں حد واجب سے آگے نہ بڑھے۔

جہاں تک بیوی بچوں کے دفاع کی قانونی حیثیت کا تعلق ہے، اس کے

۱۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۵/۶

۲۔ ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی العصبیۃ۔ اس کے ایک راوی ایوب بن سوید کو امام
ابوداؤد نے ضعیف قرار دیا ہے۔

۳۔ مناوی، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۵۳۳/۱

بارے میں علامہ نوویؒ کہتے ہیں:

و اما المدافعة عن الحریم
فواجبة بلا خلاف^۱
جہاں تک بیوی بچوں کی طرف سے دفاع کا
تعلق ہے اس کے واجب ہونے میں کوئی
اختلاف نہیں ہے۔

عفت و عصمت کا دفاع

عفت و عصمت بھی انسان کا ایک بنیادی حق ہے۔ اس پر حملہ ہو تو وہ آخری
حد تک دفاع کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں حملہ آور کو جو نقصان پہنچے گا اس کی ذمہ داری اس
پر عائد نہ ہوگی۔ فقہ حنفی میں ہے۔

اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ زبردستی زنا کرنا چاہے اور اسے یقین ہو کہ
چیخ پکار یا مار پیٹ سے وہ نہیں بھاگے گا تو اسے وہ قتل کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں مقتول
کا خون رائیگاں جائے گا۔ یہی حق کم عمر لڑکے کو بھی حاصل ہوگا جس کے ساتھ زبردستی
بدفعلی کی کوشش کی جائے۔^۲

امام احمدؒ سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت پر برے ارادے سے حملہ
کرے اور وہ اپنی عفت کے تحفظ کی خاطر اسے قتل کر دے تو کیا حکم ہے؟ انھوں نے
فرمایا اگر عورت کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کی عصمت دری چاہتا ہے تو اسے وہ قتل
کر سکتی ہے۔ اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے حضرت عمرؓ کے ایک
فیصلہ کا بھی ذکر فرمایا کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ بدکاری کرنی چاہی تو اس
نے پتھر سے مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم اس کی دیت نہیں
دی جائے گی۔^۳

۱۔ نووی، شرح مسلم ۸۱/۱

۲۔ علاء الدین و ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۲۳۸/۳

۳۔ ابن قدامہ المغنی: ۵۳۳/۱۲

کیا عفت و عصمت کا دفاع واجب ہے؟

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ بدکاری کرنا چاہے تو اس کے لیے دفاع واجب ہے، اس لیے کہ کسی کو عصمت دری کا موقع دینا حرام ہے۔ دفاع نہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ عورت لمبک طرح سے حملہ آور کو اس کا موقع دے رہی ہے۔

دفاع میں تعاون

کسی کی جان، مال، عزت و آبرو یا بیوی بچوں پر حملہ ہو تو اسلام، معاشرہ کی یہ اخلاقی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ جو شخص اس حملہ کو روک سکتا ہو روکے اور مظلوم کے دفاع میں جو بھی مدد کر سکتا ہو کرے۔ اس سے آگے وہ اس کی بھی اجازت دیتا ہے کہ مظلوم کو بچانے کے لیے اگر اسے حملہ آور کی جان بھی لینی پڑے تو وہ لے سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کا ہر اقدام قانونی حدود کے اندر ہونا چاہیے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

کوئی شخص کسی کی جان اور مال پر دست درازی کرے یا کسی عورت کی عصمت دری کرنا چاہے تو جس پر حملہ نہیں ہوا ہے اسے ان کو بچانے میں مدد کرنی چاہیے۔ اسی طرح اگر چور اور ڈاکو کسی قافلہ سے تعرض کریں تو جو لوگ قافلہ میں نہیں ہیں انھیں اس کی اجازت ہے کہ قافلہ والوں کا دفاع کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم“ ایک اور حدیث میں ہے کہ ”فتنہ پردازوں کے خلاف مومن ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں“ اگر (ظلم کے خلاف) ایک دوسرے کا تعاون نہ ہو تو لوگوں کی جان اور مال سب ہی کچھ لٹ سکتا ہے۔ چور اور ڈاکو کسی کا مال چھین لیں اور دوسرا اس کی مدد نہ کرے تو وہ یکے بعد دیگرے سب ہی کا مال چھین لے جائیں

۱۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۲/۵۳۳

گے۔ اسی طرح دوسروں کا معاملہ ہے۔^۱

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے:

کوئی شخص کسی پر تلوار اٹھائے اور دوسرا شخص حملہ آور کو قتل کر دے تو قانوناً اس کی گرفت نہ ہوگی۔^۲

لیکن اس کے ساتھ قانون یہ بھی دیکھے گا کہ بلا وجہ کسی کی جان نہ لی گئی ہو۔

اگر کوئی شخص حملہ کے بعد اس طرح بھاگ کھڑا ہو کہ دوبارہ اس کی طرف حملہ کا اندیشہ نہ ہو تو جس پر حملہ ہوا ہے وہ یا کوئی دوسرا فرد اسے قتل کر دے تو وہ مجرم قرار پائے گا اور اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔^۳

جب کوئی شخص یہ دیکھے کہ چور کسی کے گھر سوراخ کر رہا ہے اور چیخنے چلانے کے باوجود وہ بھاگ نہیں رہا ہے تو اس کے لیے اس کا قتل کر دینا جائز ہوگا۔^۴

اگر آدمی یہ دیکھے کہ کوئی شخص کسی نامحرم عورت کے ساتھ ہے اور اسے یقین ہو جائے کہ وہ شور کرنے، ڈرانے دھمکانے یا لالچی وغیرہ غیر مہلک ہتھیار استعمال کرنے سے عورت کو نہیں چھوڑے گا تو اسے وہ قتل کر سکتا ہے۔ لیکن اگر قتل کیے بغیر اس کا بھگانا ممکن ہو تو قتل کرنا صحیح نہ ہوگا۔^۵

یہی حکم ان بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کا ہے جن سے دوسروں کو نقصان پہنچے۔ کھلم کھلا اور علانیہ ظلم و زیادتی کرنے والوں کا بھی یہی حکم ہے۔ عام افراد کے لیے اس کی حیثیت جواز کی ہے اور حکومت کے لیے اس پر عمل کرنا واجب ہے۔^۶

۱۔ ابن قدامہ، المغنی: ۵۳۴/۱۲-۵۳۵

۲۔ علاء الدین و ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۴۸۱/۵

۳۔ حوالہ سابق ص ۴۸۲

۴۔ حوالہ سابق

۵۔ علاء الدین و ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۴۴۸/۲

۶۔ علاء الدین و ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۴۴۹/۲

دفاع کا حق

یہ ایک فرد کی بات تھی۔ اگر کوئی شخص کسی جگہ عام مسلم آبادی کے خلاف تلوار اٹھائے اور علانیہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع کر دے تو قطع نظر اس کے کہ اس نے کس پر حملہ کیا اور کون اس کے حملہ سے محفوظ رہا یہ سب ہی کا فرض ہے کہ اسے اس سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ اس میں کسی طرح کی کامیابی نہ ہو تو اسے قتل کر دیں۔ جو شخص اسے قتل کرے اس پر دیت یا قصاص واجب نہیں ہوگی۔ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی کہتے ہیں: اس کی ایک دلیل تو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

من شہر علی المسلمین سیفاً جس شخص نے مسلمانوں کے خلاف تلوار کھینچی
فقد اطل دمه۔ اس نے اپنا خون ضائع کیا۔ (اس کی قیمت نہیں رہی)

دوسرے یہ کہ وہ اسلامی ریاست کا باغی ہے اور بغاوت کی وجہ سے وہ معصوم بالدم نہیں رہا۔ لہذا اس کا خون بہایا جاسکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس نے اپنے قتل پر خود ہی مجبور کر دیا کہ اس کے علاوہ جان بچانے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔^۱

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ اسلامی ریاست میں جو حکم مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے والے کا ہے وہی حکم ذمیوں پر تلوار اٹھانے والے کا بھی ہے۔^۲
اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ذمیوں کے خلاف تلوار اٹھاتا ہے، چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اگر قتل کیے بغیر اسے اس سے روکا نہ جاسکے تو ضروری ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

۱۔ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں نہیں آئی ہے البتہ اس کی ہم معنی روایات نسائی، اسحاق، حاکم اور طبرانی وغیرہ نے نقل کی ہیں۔ نسائی کے الفاظ یہ ہیں۔ من شہر سیفہ ثم وضعہ قدمہ ہدر۔ کتاب المحاربه (کتاب تحریم الدم) باب من شہر سیفہ (جس نے اپنی تلوار کھینچی اور اسے لوگوں کے درمیان خون ریزی کے لیے استعمال کیا تو اس کا خون رائیگاں گیا) تفصیل کے لیے دیکھی جائے الدراية فی تخریج احادیث الہدایہ ص ۳۶۳

۲۔ مرغینانی، ہدایہ: ۵۶۴/۴

۳۔ ابن عابدین، رد المحتار: ۴۸۱/۵

دفاع کرنے والے پر حملہ آور کے نقصان کی ذمہ داری نہیں ہے

دفاع میں حملہ آور کی جان بھی جاسکتی ہے۔ اس کا کوئی دوسرا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نقصان اس کے حملہ کی وجہ سے ہو تو دفاع کرنے والے سے قصاص یا دیت نہیں لی جائے گی۔

حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت ہے کہ دو اشخاص کے درمیان جھگڑا ہوا۔ ایک نے دوسرے کا ہاتھ کاٹ لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ زور سے کھینچا تو کاٹنے والے کے اگلے دونوں دانت گر پڑے۔ ان کا یہ نزاع رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ جس کے دانت گرے تھے اس نے دیت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کسی کا ہاتھ اونٹ کی طرح چبائے تو کیا وہ خاموش ہو جائے۔ جاؤ اس کی کوئی دیت نہیں ہے! اس حدیث سے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ وغیرہ جمہور علما نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا ہاتھ دانتوں سے کاٹے اور اسے چھڑانے کی کوشش میں اس کے دانت ٹوٹ جائیں تو چھڑانے والے پر قصاص یا دیت واجب نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اس کی نوعیت حملہ آور سے اپنے دفاع کی ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کی وجہ سے کسی کے دانت ٹوٹے وہ اس کا ضامن ہوگا۔ امام مالکؒ کی تائید میں جو دلیلیں دی گئی ہیں حافظ ابن حجرؒ نے ان سب کی تردید کی ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ امام مالکؒ تک غالباً یہ حدیث نہیں پہنچی ورنہ وہ نص کے مقابلہ میں قیاس سے کام نہ لیتے۔^۱

لیکن مالکیہ میں متاخرین نے اس حدیث کا موقع محل متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

۱۔ بخاری، کتاب الدیات، باب اذا عض الرجل فوقعت ثنایاہ۔ مسلم، کتاب

القسمۃ والمحاربین، باب الصائل علی نفس الانسان أو عضوه الخ

۲۔ ملاحظہ ہو شرح مسلم، نووی، جلد ۶، جز ۱۱، ص ۱۳۳۔ فتح الباری ۱۲/۱۸۰

دفاع کا حق

اگر کوئی شخص کسی کا ہاتھ دانتوں سے کاٹے اور وہ اپنا ہاتھ قصداً اس طرح کھینچے کہ کاٹنے والے کے دانت ٹوٹ پڑیں تو اس پر دیت واجب ہوگی۔ لیکن اگر وہ قصداً ایسا نہ کرے اور اس کے لیے یہ ممکن نہ ہو کہ اس کے دانت ٹوٹے بغیر اپنا ہاتھ منہ سے چھڑا سکے تو اس پر دیت واجب نہیں ہوگی۔ اس کی تائید میں مذکورہ بالا حدیث پیش کی گئی ہے۔ یہی بات جمہور نے بھی کہی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

جمہور کے نزدیک دفاع کرنے والے پر سے حملہ آور کے دانت ٹوٹنے کی ذمہ داری اس وقت ساقط ہوگی جب کہ دو شرطیں پائی جائیں۔ ایک یہ کہ حملہ آور نے دانتوں سے اس طرح کاٹا ہو کہ دفاع کرنے والے نے اس کا درد اور تکلیف محسوس کی ہو۔ دوسری شرط یہ کہ سختی سے ہاتھ چھڑائے بغیر اس کے لیے کوئی چارہ کار نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ حملہ آور کے منہ پر یا گال پر تھپڑ مار کو اسے نکال نہ سکے۔ اس امکان کے باوجود اس نے قصداً ہاتھ کو اس طرح چھڑانے کی کوشش کی کہ حملہ آور کے دانت گر پڑے تو اس کا اقدام معاف نہیں ہوگا۔^۱

بعض حضرات نے اس کی ایک خاص ترتیب بھی بیان کی ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے بعض دوسری الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔^۲

شوافع کے ہاں بھی ایک رائے یہ ہے کہ جو شخص کسی کو دانتوں سے کاٹ رہا ہو اسے اپنا ہاتھ کھینچنے کا مطلقاً حق حاصل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کوئی دوسرا آسان طریقہ اختیار کر سکتا ہے یا نہیں؟^۳

۱۔ احمد الدردیر، الشرح الصغير على اقرب المسالك: ۵۰۶/۴

۲۔ ابن حجر، فتح الباری: ۱۸۰/۱۲ ۳۔ المغنی: ۵۳۸/۱۲، ۵۳۹

۴۔ علامہ شوکانی کا بھی یہی رجحان ہے۔ نیل الاوطار ۱۷۲/۷۔ اگر کوئی شخص کسی کو دانتوں سے کاٹے تو اسے دفاع کس طرح کرنا چاہیے اس پر بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن جہاں تک دفاع میں ترتیب کا تعلق ہے وہ بہر حال ضروری ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

جس شخص کو اس طرح دانتوں سے کاٹا جائے وہ اپنے دفاع میں کاٹنے والے کو کسی بھی جگہ چوٹ پہنچا سکتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔

ولو جرحه العضوض في موضع آخر لم يلزمه شيء
جس شخص کو دانتوں سے کاٹا گیا ہے وہ اگر کاٹنے والے کو کسی دوسری جگہ زخمی کر دے تو اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

دانت سے کاٹنا ایک مثال ہے جس کا زیر بحث حدیث میں ذکر آیا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ حملہ کسی بھی نوعیت کا ہو آدمی کو دفاع کا حق ہے اور اس کے نتیجہ میں حملہ آور کا کوئی نقصان ہو، حتیٰ کہ اس کی جان چلی جائے تو بھی دفاع کرنے والے پر اس کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔

فيه دفع الصائل و انه اذا لم يكن الخلاص منه الا بجناية على نفسه او على بعض اعضائه ففعل به ذلك كان هدرا
اس حدیث میں حملہ آور کے دفاع کا ثبوت ہے۔ حملہ آور کی جان لیے بغیر یا اس کے کسی عضو کو نقصان پہنچائے بغیر حملہ سے بچنے کا امکان نہ ہونے کی صورت میں دفاع کرنے والا ایسا کوئی اقدام کر گزرے تو اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوگی۔

یہی حکم ہے جب کہ وہ ہاتھ کے علاوہ کسی اور جگہ اسے کاٹے یا کاٹنے کے علاوہ کوئی ایسا اقدام کرے جس کے نتیجہ میں حملہ آور کا کوئی نقصان ہو تو دفاع کرنے والا اس کا ضامن نہ ہوگا۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:
... كذلك الحكم في ما اذا عضه في غير يده او عمل به عملا غير العض اقضى الي تلف شيء من الفاعل لم يضمنه^۱

۱۔ فتح الباری، ۱۲/۱۸۰

۲۔ فتح الباری، ۱۲/۱۸۰

۳۔ المغنی، ۱۲/۵۳۸

دفاعی اقدام میں الاسہل فالاسہل کا اصول

مال کے دفاع کے سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ یہ حدیث مسند احمد میں ان الفاظ میں آئی ہے:

یا رسول اللہ أرأیت ان عدی
علی مالی قال فانشد اللہ قال
فان ابوا علی قال انشد اللہ قال
فان ابوا علی قال فانشد اللہ قال
فان ابوا علی قال فقاتل فان
قتلت ففي الجنة و ان قتلت
ففي النار

اے اللہ کے رسول ﷺ اگر میرے مال کے
ساتھ زیادتی ہو (اسے چھیننے کی کوشش کی
جائے) تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے
فرمایا چھیننے والوں کو اللہ کا واسطہ دو۔ اس نے
عرض کیا۔ اگر وہ میری بات نہ مانیں تو کیا
کیا جائے؟ آپ نے فرمایا انھیں اللہ کا
واسطہ دو۔ اس نے عرض کیا، پھر بھی وہ نہ
مانیں تو کیا کیا جائے؟ آپ نے (تیسری
بار) فرمایا انھیں اللہ کا واسطہ دو۔ اس نے کہا
اس پر بھی وہ نہ مانیں تو کیا کیا جائے۔ آپ
نے فرمایا: ان کا مقابلہ کرو۔ اگر تم مارے گئے
تو جنت میں جاؤ گے اور اگر تم نے اسے قتل کر
ڈالا تو وہ جہنم میں جائے گا۔

اس حدیث نے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ دفاع میں الاسہل فالاسہل کے اصول
پر عمل کیا جائے گا۔^۱

اس کا مطلب یہ ہے کہ دفاع کی جو آسان سے آسان تدبیر ممکن ہو وہ اختیار
کی جائے گی۔ یہ تدبیر ناکافی یا غیر موثر ہو تو نسبتاً سخت طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اگر یہ
بھی غیر موثر یا بے سود محسوس ہو تو اس سے بھی سخت تدبیر اختیار کی جائے گی۔ اگر حملہ آور
چینچ پکار سے فرار ہو سکتا ہو تو اسے لاٹھی مار کر بھگانے کی کوشش نہیں کی جائے گی یا اسے

۱۔ مسند احمد: ۳۳۹/۲۔ نسائی، کتاب تحریم الدم، باب ما یفعل من تعرض لماله

۲۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۷/۴۷

لاٹھی سے مار کر بھگایا جاسکتا ہو تو تلوار سے اسے ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ علامہ شوکانیؒ کہتے ہیں:

ينبغي تقديم الاخف فالأخف
فلا يعدل المدافع الى القتل مع
امكان الدفع بدونه ويدل على
ذلك امره صلى الله عليه
وسلم بانشاد الله قبل المقاتلة^۱
دفاع کا سب سے پہلے آسان طریقہ اختیار
کرنا چاہیے پھر اس کے بعد نسبتاً سخت طریقہ
اختیار کیا جائے۔ جب تک قتل کے بغیر دفاع
کا امکان موجود ہے، دفاع کرنے والا اقدام
قتل نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کا سائل کو
یہ حکم دینا کہ قتال سے پہلے وہ حملہ آور کو اللہ
کا واسطہ دے، اسی کی دلیل ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے مکان میں گھس پڑے اور
صاحب مکان کے للکار نے اور شور مچانے سے وہ نکل جائے تو صاحب مکان کو اس کی
جان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لیے کہ مقصود صرف یہی ہے کہ وہ مکان سے چلا
جائے۔ اسی طرح اگر یہ معلوم ہو کہ لاٹھی اور ڈنڈے کے استعمال سے وہ بھاگ کھڑا ہوگا
تو مہلک ہتھیار کے استعمال کی اسے اجازت نہ ہوگی۔ اگر حملہ آور کو زخمی کر کے بے کار
کر دیا جائے اور وہ حملہ کے قابل نہ رہے تو اس کو قتل کرنے کا حق نہ ہوگا (اس احتیاط
کے باوجود) مقابلہ میں حملہ آور مارا جائے تو اس کا خون رائیگاں جائے گا۔ دفاع کرنے
والا اس کا ذمہ دار نہ قرار پائے گا، اس لیے کہ اس صورت میں گویا حملہ آور نے خود ہی
صاحب مکان کو اس پر مجبور کیا تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس
نے خود کشی کی ہے۔^۲

فقہ حنفی میں ہے کہ اگر رات میں کوئی شخص کسی کے گھر گھس کر اس کا مال و
اسباب لوٹنا چاہے تو اسے وہ قتل کر سکتا ہے۔ اسی طرح مال و اسباب لے کر بھاگے تو اس

۱۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۷۵/۶

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ المغنی: ۵۳۱/۱۲-۵۳۲

کا پیچھا کر کے بھی قتل کر سکتا ہے، بشرطے کہ قتل کے سوا مال کے واپس لینے کی کوئی صورت نہ ہو۔

یہی بات ان الفاظ میں بھی کہی گئی ہے:

هذا اذا لم يعلم انه لو صاح عليه طرح ماله و ان علمه ذلك فقتله مع ذلك وجب عليه القصاص
چور کا قتل کرنا اس وقت اس کے لیے صحیح ہوگا جب کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اس کے شور و غل مچانے سے چور اس کا مال پھینک دے گا لیکن اگر یہ جاننے کے باوجود اسے وہ قتل کر دے تو اس پر قصاص واجب ہو جائے گا۔

اسلامی ریاست میں جو شخص مسلمانوں یا ذمیوں کے خلاف تلوار اٹھائے اس کا حکم اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس ذیل میں فقہ حنفی میں کہا گیا ہے۔

ويجب دفع من شهر سيفاً على المسلمين ولو بقتله ان لم يمكن دفع ضرره الا به
جو شخص مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھائے اس کا دفع کرنا ضروری ہے، چاہے اس کے لیے اسے قتل کرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ بشرطے کہ کسی اور طریقہ سے اس کے ضرر کو دفع کرنا ممکن نہ ہو۔

اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اصلاً دفع ضرر واجب ہے۔ نہ کہ کسی کو قتل کرنا اور جان لینا۔ اگر کسی کی جان لیے بغیر بھی دفع ضرر ممکن ہو تو اس کی جان ہرگز نہیں لی جائے گی۔ یہ اقدام صرف مجبوری ہی میں ہو سکتا ہے۔

کسی بھی اقدام کا فیصلہ حالات کے تحت ہوگا

یہ بات کہ کس وقت کون سا دفاعی اقدام صحیح اور قانون کے تحت ہوگا اور کون سا اقدام غلط اور غیر قانونی قرار پائے گا اس کا فیصلہ حملہ کی نوعیت اور ان حالات کے

۱۔ مرغینانی، ہدایہ: ۵۶۵/۴

۲۔ ابن عابدین، رد المحتار: ۴۸۶/۵

۳۔ ابن عابدین، رد المحتار مع در المختار: ۴۸۱/۵

پیش نظر ہوگا جن میں حملہ ہوا ہے۔

اگر کوئی شخص جان لینے کے ارادے سے کسی پر تلوار اٹھائے (یا کوئی مہلک ہتھیار استعمال کرے) تو اسے اپنے دفاع میں حملہ آور کو قتل کرنے کا حق ہے، خواہ حملہ آبادی میں ہو یا غیر آباد جگہ میں، رات میں ہو یا دن میں، اس لیے کہ اس میں تاخیر سے اس کی جان جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن اگر لاٹھی یا چھڑی یا کسی غیر مہلک ہتھیار سے حملہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ حملہ کہاں ہوا ہے اور کس وقت ہوا ہے؟ اگر حملہ آبادی میں ہو اور دن میں ہو تو اسے حملہ آور کو قتل کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ مدد کے لیے دوسروں کو بلا سکتا ہے اور مدد کے پہنچنے تک اس کی جان جانے کا خطرہ نہیں ہے۔ لیکن اگر حملہ رات میں اور کسی سنسان جگہ میں ہو تو اسے اپنے دفاع میں حملہ آور کو قتل کرنے کا حق ہوگا، اس لیے کہ وہاں کسی مدد کا پہنچنا مشکل ہے۔ لاٹھی یا ڈنڈا اس قسم کا ہو کہ اس سے موت واقع ہو سکتی ہو تو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے یہ قول یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ حملہ رات میں ہوا ہے یا دن میں ہوا ہے۔

مال کے دفاع میں کسی چور اور ڈاکو کو اسی وقت قتل کیا جاسکتا ہے جب کہ (قرائن سے) یہ معلوم ہو کہ چیخنے چلانے سے وہ مال چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ڈرانے دھمکانے اور شور مچانے سے بھاگ کھڑا ہوگا اسے قتل کر دیا جائے تو قاتل پر قصاص واجب ہوگا۔^۱

دفاعی اقدام کے لیے ثبوت چاہیے

کسی بھی دفاعی اقدام کے لیے ثبوت کا پایا جانا ضروری ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں:

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ فلاں شخص اس کے گھر گھس آیا تھا اور اسے قتل

۱۔ مرغینانی، ہدایہ: ۵۶۴/۴

۲۔ در المختار مع رد المحتار: ۲۸۲/۵

دفاع کا حق

کیے بغیر اسے بھگانے کی کوئی صورت نہیں تھی تو بغیر ثبوت کے اس کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اس بات سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مقتول چوری اور مکاری میں مشہور تھا یا نہیں؟ گواہوں کو اس امر کی گواہی دینی ہوگی کہ انھوں نے مقتول کو معروف قسم کے ہتھیار (جن سے کسی کی جان لی جاسکتی ہے) لے کر قاتل کی طرف پیش قدمی کرتے دیکھا اور قاتل نے اسے اپنے دفاع میں قتل کیا۔ لیکن اگر گواہوں نے یہ گواہی دی کہ ہم نے اس شخص کو محض اس کے گھر جاتے دیکھا اور اسلحہ کا ذکر نہیں کیا یا اسلحہ کا ذکر کیا مگر مشہور اسلحہ کا ذکر نہیں کیا تو اس سے قصاص ساقط نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ آدمی کسی کے گھر کسی بھی ضرورت سے داخل ہو سکتا ہے۔ محض کسی کے گھر داخل ہو جانے سے اس کا خون بہانا جائز نہیں ہو جاتا۔^۱

لیکن ایسے حالات ہو سکتے ہیں جن میں عینی شاہد موجود نہ ہوں۔ اگر اس اندیشہ سے کہ گواہی دینے والا کوئی موجود نہیں ہے آدمی دفاع نہ کرے تو اس کی جان اور مال کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ فقہ حنفی میں اسے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اگر آدمی اس بات کا ثبوت فراہم کر دے کہ جو شخص گھر میں گھس آیا تھا اس نے اس سے رد و کد کی اور مقابلہ کیا تو اس کا اسے قتل کرنا صحیح ہوگا۔ اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ یہ ثبوت فراہم نہ کر سکے تو دیکھا جائے گا کہ جس شخص کو اس نے قتل کیا ہے وہ شرف و فساد میں مشہور تھا یا نہیں؟ اگر وہ اس حیثیت سے مشہور نہیں تھا تو صاحب مکان سے قصاص لیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ اس پہلو سے مشہور تھا تو بھی قیاس یہی کہتا ہے کہ اس سے قصاص لیا جائے، لیکن استحسان یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو قاتل سے دیت دلوائی جائے۔ کیوں کہ حالات نے قصاص کے بارے میں تو شبہ میں ڈال دیا ہے۔ لیکن کم از کم دیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔^۲

۱۔ المغنی: ۱۲/۵۳۶-۵۳۷

۲۔ ابن عابدین، رد المحتار: ۵/۴۸۲

اگر دو آدمی لڑ کر ایک دوسرے کو زخمی کر دیں اور ہر ایک یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اپنے دفاع میں دوسرے کو زخمی کیا ہے تو ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں کہ دونوں سے کہا جائے گا کہ وہ مخالف کے دعویٰ کے غلط ہونے پر قسم کھائیں۔ جب وہ قسم کھائیں تو جس کو زخم لگا ہے اس کا ضمان دوسرے پر واجب ہوگا۔ اس لیے کہ دونوں میں سے ایک جو دعویٰ کر رہا ہے دوسرا اس کا منکر ہے۔ جب کہ اصل اس کا عدم وجود ہے۔^۱

دفاعی اقدام حملہ کے وقت ہوگا

دفاع کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جس وقت حملہ ہو اسی وقت دفاع ہوتا ہے۔ حملہ کے بعد دفاع کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

اگر کوئی شخص حملہ کر کے اس طرح پیچھے ہٹ جائے کہ دوبارہ اس کے حملہ کرنے کا اندیشہ نہ ہو اس کے بعد جس پر حملہ ہوا ہے وہ یا کوئی دوسرا شخص آگے بڑھ کر اسے قتل کر دے تو قاتل پر قصاص واجب ہو جائے گا۔ اس لیے کہ جوں ہی حملہ آور پیچھے ہٹا اور حملہ سے باز آ گیا تو جیسے وہ پہلے معصوم الدم تھا دوبارہ معصوم الدم ہو گیا۔ اس کے خون بہانے کا حق نہیں ہے۔^۲

البتہ پیچھے ہٹنے کے باوجود اگر وہ تلوار لیے ہوئے ہے (اور اس کے دوبارہ حملہ کرنے کا اندیشہ ہے) تو اسے قتل کیا جاسکتا ہے۔^۳

خلاصہ بحث

اس طرح اسلام مظلوم کے اندر یہ عزم و حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی جان، مال، عزت آبرو، بیوی، بچوں، اہل خاندان اور اپنے دین و ایمان کو دوسروں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑے، بلکہ جور و تعدی جس طرف سے بھی ہو اس کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ وہ

۱۔ المغنی: ۱۲/۵۳۷

۲۔ ہدایہ: ۴/۵۶۵

۳۔ ابن عابدین، در المختار مع رد المختار: ۵/۴۶۲

دفاع کا حق

معاشرہ کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ظلم کے دفاع کے لیے خود بھی کھڑا ہو، دفاع میں مظلوم کا ساتھ دے اور ظلم کو مٹانے اور مظلوم کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ پھر یہ کہ ظلم کے روکنے کے لیے مظلوم اور اس کے ساتھ پورا معاشرہ جو قدم اٹھائے اسے وہ قانوناً سند جواز عطا کرتا ہے تاکہ وہ کسی وقت بھی قانونی لحاظ سے خود کو بے بس اور مجبور نہ محسوس کرے۔ اسی کے ساتھ وہ اس بات کی بھی نگرانی کرتا ہے کہ خود مظلوم کسی مرحلہ میں ظالم نہ بنے پائے اور دفاع کے نام پر ظلم نہ کرنے لگے۔

مذہب کی آزادی کا حق

مذہب کی آزادی کا حق

اسلام نے انسان کو جو حقوق دیے ہیں ان کے ذیل میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے؟ اس سوال کو بعض اوقات اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے وہ اسلامی ریاست میں اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے اور انھیں بہ جبر اسلامی احکام کا پابند بنایا جائے گا۔ یہاں اس مسئلہ میں اسلام کے موقف کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

عقیدہ اور مذہب کے لیے جبر کی اجازت نہیں ہے

اسلام اس حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ اب دنیا میں وہی واحد دین حق ہے۔ اس کے علاوہ جتنے مذاہب ہیں گو وہ صداقت سے خالی نہیں ہیں، ان میں سچائی کا عنصر ہونسکتا ہے اور ہے، لیکن وہ حق و باطل کا مجموعہ ہو کر رہ گئے ہیں، اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے اپنے اس موقف کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن کسی کو اس پر مجبور نہیں کیا ہے، بلکہ اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کی آزادی عطا کی ہے۔

نبی ﷺ کے اندر یہ فطری خواہش تھی کہ سب لوگ اسلام کو اللہ کے دین کی حیثیت سے قبول کر لیں لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا کہ آپ کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ

اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف ہے۔ وہ چاہتا تو خود ہی سب کو بزور و جبر اپنے دین کا پابند بنا دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ہے، بلکہ انسان کو آزادی دی ہے کہ وہ اس کے دین کو چاہے قبول کرے یا نہ کرے۔ جب اس نے آزادی دی ہے تو کوئی بھی شخص اسے اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مِنَ فِي
الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ
تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا
مُؤْمِنِينَ ۝ (یونس: ۹۹)

اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے سارے
کے سارے لوگ ایمان لے ہی آتے۔ تو
کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ ایمان
والے ہو جائیں۔

سورہ انعام میں یہی بات اور پرزور انداز میں کہی گئی ہے۔

وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ
فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي
الْأَرْضِ أَوْ سُلْمًا فِي السَّمَاءِ
فَتَاتِيهِمْ بَائَةً وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ
مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ
الَّذِينَ يَسْمَعُونَ وَالْمَوْتَىٰ
يَعْتَهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝

اگر تم پر ان کا اعراض کرنا شاق گزرے تو تم
سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرو
یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگاؤ اور ان کے
پاس کوئی نشانی لے آؤ۔ ایسا کر دیکھو۔ اگر
اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔
پس تم ہرگز نادانوں میں سے نہ بنو۔ ہماری
باتیں وہی مانیں گے جو سنتے ہیں، باقی جو
مردہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کو (قیامت میں)
اٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں
گے۔

(الانعام: ۲۵-۳۶)

اس کا واضح اعلان ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ
الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ
بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدْ
اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ

دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے۔
ہدایت، ضلالت اور گم راہی سے الگ واضح
ہو چکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت کا انکار کرے
اور اللہ پر ایمان لے آئے تو اس نے

مذہب کی آزادی کا حق

لَا اِنْفِصَامَ لِهَاءِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ
(البقرة: ۲۵۶) اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔
مضبوط سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ جب اس نے دین و مذہب کے معاملہ میں جبر نہیں رکھا ہے، تو خود اس کی راہ میں بھی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ جو شخص اسے قبول کرنا چاہے آزادی سے قبول کر سکے، اس کی راہ روکنا اور اس پر بندش لگانا اس کی حریت فکر پر دست درازی ہے۔ ایک شخص دنیا کے کسی بھی نظریہ حیات کو قبول کرنے کا حق رکھتا ہے تو معقول اور منطقی بات ہے کہ اسے اسلام کے نظریہ حیات کو اپنانے کا بھی حق ملنا چاہیے۔ لیکن اسلام کے مخالفین اس کے بارے میں یہ رویہ نہیں اختیار کرتے اور وہ آزادی فکر کے حق کو پامال کرتے اور جبر کے تالے انسانوں پر لگاتے ہیں۔ ایک ہی معاملہ میں دو الگ الگ پیمانے اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اسلام نے کہا کہ یہ جبر اور بندش خدا کے نزدیک سخت ناروا اور مذموم ہے۔ اس کی پکڑ سے وہ قیامت کے روز بچ نہیں سکتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلًّاۭۢاۤ بَعِيْدًاۙ
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرْ لَهُمْ وَاَلَا لِيَهْدِيْهِمْ طَرِيْقًاۙ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۙ اَبَدًاۙ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًاۙ
(النساء: ۱۶۷-۱۶۹)

بے شک جن لوگوں نے خود کفر کی روش اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکا وہ گم راہی میں بہت دور جا پڑے۔ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور (اپنی ایمان پر) ظلم کیا اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ اور انھیں جہنم کے راستے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں دکھائے گا۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔

قرآن مجید نے پیغمبروں اور خدا پرست انسانوں کی تاریخ پیش کی ہے کہ انھیں اللہ کے دین کے مطابق عمل کرنے اور اسے اللہ کے بندوں کے سامنے پیش کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ انھیں دعوت و تبلیغ کا حق دینے سے انکار کیا گیا اور مخاطبین کو اس

کے قبول کرنے سے بہ جبر روکنے کی کوشش کی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعوت حق ہی کے جرم میں آگ میں ڈالا گیا۔ حضرت موسیٰ کے قتل کا باہم مشورہ ہونے لگا تو اللہ کے ایک بندہ نے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔

اتَّقَتُلُون رَجُلًا اَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللّٰهُ
وَ قَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ
وَ اِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ
وَ اِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِيبْكُمْ بَعْضُ
الَّذِي يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ
هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ (مومن: ۲۸)

کیا تم قتل کرو گے ایک ایسے شخص کو جو کہتا ہے کہ
میرا رب اللہ ہے۔ جب کہ وہ تمہارے رب کی
طرف سے کھلی نشانیاں لے کر آیا ہے۔ اگر وہ
جھوٹا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہوگا اور اگر وہ سچا
ہے تو (جس دنیا و آخرت کے) عذاب کی وہ
دھمکی دے رہا ہے۔ اس کا ایک حصہ تم پر آئے
گا۔ بے شک اللہ راہ نہیں دکھاتا اس شخص کو جو حد
سے گزر جانے والا اور انتہائی جھوٹا ہے۔

حضرت موسیٰ ہی کی تاریخ کا واقعہ ہے کہ ان کی دعوت اور ان کے معجزات کے مقابلے کے لیے جادوگر بلائے گئے۔ لیکن جلد ہی جادوگروں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حضرت موسیٰ حق پر ہیں، ساحرانہ کرتبوں کے ذریعہ ان کے معجزات کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لے آئے۔ اس پر فرعون طیش میں آ گیا اور اس کی آتش غضب اس قدر بھڑک اٹھی کہ اس نے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دینے اور سولی پر چڑھا دینے کا حکم جاری کر دیا۔ اُن اللہ کے بندوں نے سب کچھ صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کیا۔

قَالُوا اِنَّا اِلَى رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ۝ وَمَا
تَنْقِمُ مِنَّا اِلَّا اَنْ اٰمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا
جَاءَ تَنَاطُرُ رَبِّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَ
تَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ۝

انہوں نے کہا ہمیں تو اپنے رب کی طرف
لوٹ کر جانا ہی ہے۔ تم محض اس بات پر
انتقام لے رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی
آیات پر، جب وہ ہمارے سامنے آئیں،
ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! ہم پر
صبر نازل فرما اور ہم کو اپنے فرماں بردار کی
حیثیت میں وفات دے۔

(الاعراف: ۱۲۵-۱۲۶)

مذہب کی آزادی کا حق

قرآن مجید نے اصحاب اخدود کا ذکر کیا ہے کہ انھیں محض اس جرم میں دہکتی آگ میں پھینک دیا گیا کہ خدائے واحد پر، جو زمین و آسمان کا مالک ہے، وہ ایمان رکھتے ہیں:

قَتَلَ أَصْحَابُ الْأَخْدُودِ ۝ النَّارِ
ذَاتِ الْوُقُودِ ۝ إِذْهُمْ عَلَيْهَا
قُودٌ ۝ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ
بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۝ وَمَا نَقَمُوا
مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ
الْحَمِيدِ ۝ الَّذِي لَهُ مُلْكُ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (البروج: ۴-۹)

مارے گئے خندق (کھودنے) والے، جس
میں بہت سے ایندھن کی آگ تھی۔ جب
کہ وہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ
اہل ایمان کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے اسے
دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ان اہل ایمان
سے محض اس وجہ سے انتقام لیا کہ وہ اللہ پر
ایمان رکھتے تھے جو غالب اور ستودہ صفات
ہے، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی
ملکیت ہے اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

اصحاب کہف جو چند نوجوان تھے انھیں اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنے
ایمان کا اظہار کریں، وہ بستی کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ
نے انھیں اپنی قدرت سے اس غار میں کئی سو سال تک سلائے رکھا۔ جب وہ اپنی لمبی
نیند سے بیدار ہوئے تو کہنے لگے کہ ہم میں سے ایک آدمی احتیاط کے ساتھ بازار جائے
اور کھانے کی کوئی چیز لے آئے۔ اس احتیاط کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ
يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي
مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذَا أَبَدَا ۝

اگر وہ تم پر قابو پالیں تو وہ تمہیں سنگسار
کر کے چھوڑیں گے یا تمہیں اپنے دین میں
لوٹالے جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو تم کبھی
فلاح نہ پاؤ گے۔ (الکھف: ۲۰)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کن نازک حالات سے گزر رہے تھے۔ اور
ان کے ساتھ کس قدر سخت رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ اسلام اس طرز عمل یا Persicution کا
مخالف ہے۔

اللہ کے رسولوں کا احترام

اس دنیا میں جب سے انسان کا وجود ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی و رسالت کا سلسلہ جاری ہے۔ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ ہر زمانے اور ہر قوم میں اللہ کے رسول آتے رہے ہیں۔ ارشاد ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَ
نَذِيرًا وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا
نَذِيرٌ ۝ (یونس: ۲۴)

بے شک ہم نے آپ کو دین حق کے ساتھ
خوش خبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا
ہے۔ کوئی امت ایسی نہیں ہے جس میں
ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝
(الرعد: ۷)

آپ تو بس لوگوں کو (غلط روی کے انجام
سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم میں ایک
راہ نما گزرا ہے۔

ان میں سے بعض کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور بعض کا نہیں ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ
مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ
مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۝ (سورہ: ۷۸)

ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں۔
ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ کو
سنایا ہے اور بعض کا آپ کو نہیں سنایا۔

یہی سورہ نساء میں بعض انبیاء کے ذکر کے بعد کہی گئی ہے (النساء: ۶۴)

قرآن مجید کی رو سے ایک مسلمان کے لیے اللہ کے تمام پیغمبروں پر ایمان رکھنا اور ان کو برحق ماننا ضروری ہے۔ جن پیغمبروں کا قرآن نے نام نہ ذکر کیا ہے وہ اسی تفصیل اور تعین کے ساتھ ان کے پیغمبر ہونے کی شہادت دیتا ہے اور جن کے پیغمبر ہونے کی قرآن نے صراحت نہیں کی ہے۔ ان پر اجمالی ایمان رکھتا ہے۔ ان پیغمبروں کی جو اصل تعلیمات تھیں، قرآن ان کی تائید اور تصدیق کرتا ہے اور جن تعلیمات میں تحریف ہوگئی ہے ان کی اصلاح کرتا ہے۔

مذہب کی آزادی کا حق

ایک مسلمان اپنے ایمان اور عقیدے کے لحاظ سے کسی بھی پیغمبر کی توہین کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

ذمیوں کے حقوق

اسلامی ریاست ذمیوں (غیر مسلم رعایا) کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ ان کے ساتھ زیادتی کی وہ کسی مسلم یا غیر مسلم کو اجازت نہیں دے گی۔ ان پر کسی طرف سے حملہ ہو تو اس کا دفاع کرے گی۔

اگر وہ دشمن کے قبضے میں چلے جائیں اور انھیں اس زمانے کے دستور کے مطابق غلام بنا لیا جائے تو اسلامی ریاست انھیں ان سے رہا کرائے گی اور وہ اس کے غلام نہیں بلکہ حسب سابق آزاد ہوں گے۔ صحیح بخاری کے ایک باب کا عنوان ہے۔

يُقَاتِلُ عَنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ وَلَا اَهْلَ الذِّمَّةِ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ لَا يَمْلِكُ اَهْلُ الذِّمَّةِ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ
يَسْتَرْقُونَ

اس کی تائید میں امام بخاری نے ذمیوں سے متعلق حضرت عمرؓ کی نصیحت نقل کی ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ اس صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ذمی کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور ان کے حقوق فوت نہیں ہوں گے۔

ایک اور موقع پر کہتے ہیں:

جب کسی کے ذمی ہونے کا معاہدہ ہو جائے تو امام کے لیے اس کی حمایت کرنا ضروری ہے تاکہ مسلمان یا اہل حرب یا ذمی اس کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' بحث 'اسلام اور دیگر مذاہب' نیز 'اہل کتاب کے ساتھ اسلام کا رویہ'۔

۲۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' بحث 'ذمیوں کے حقوق'۔

۳۔ بخاری، کتاب الجہاد

۴۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/۲۹

۵۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/۲۵۰

شخصی قوانین پر عمل کا حق

اسلامی ریاست میں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب پر عمل کی آزادی ہوگی۔ جن میں عبادات، نکاح و طلاق، موت و حیات اور دیگر شخصی اور عائلی امور شامل ہیں۔ ان کے ان امور میں ریاست کی مداخلت نہ ہوگی، اس کے لیے ان کی الگ عدالتیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔ ہاں اگر وہ کسی معاملے میں اسلامی عدالت کی طرف رجوع کریں تو وہ ان کے قانون کے تحت نہیں بلکہ اپنے قانون کے تحت فیصلہ کرے گی۔

مذہب پر گفتگو ہو سکتی ہے

دین و مذہب کی حقانیت اور صداقت پر سنجیدہ گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس پر مباحثے اور تبادلہ خیال کی بھی اجازت ہوگی۔ قرآن مجید نے اس معاملے میں 'جدال حسن' کی طرح ڈالی ہے۔ ارشاد ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۝

ان سے بہتر طریقے سے مجادلہ کرو۔

(النحل: ۱۲۵)

'جدال حسن' یہ ہے کہ دلائل کے ذریعہ بات ہو اور اپنے موقف کی صداقت کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ مذہب پر گفتگو کے عنوان سے تعصب اور نفرت کی فضا پیدا کرنا اور جنگ و جدال کا بازار گرم کرنا ممنوع ہے۔

اس حساس مسئلہ میں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ مجلس میں افہام و تفہیم کی جگہ مخاطب کی طرف سے بات کو الجھانے اور اسے غلط رخ دینے کی کوشش ہونے لگے تو مجلس چھوڑ دی جائے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون 'اسلامی ریاست میں غیر مسلموں پر اسلامی قانون کا نفاذ

کس حد تک ہوگا'۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۴ء

مذہب کی آزادی کا حق

جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں الجھے چلے جا رہے ہیں، تو ان سے رخ پھیر لو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔ اگر شیطان تمہیں اس سے بھول میں ڈال دے تو یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھو۔

وَ إِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي
اِثْنًا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا
فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ؕ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ
الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى
مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ (الرعد: ۷)

مذہب پر اظہار خیال کے اس سے زیادہ معقول اور مہذب طریقے کا تصور بھی مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

مذہب پر گفتگو کے حدود

مذہب پر گفتگو ہو تو اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں، اس کی نازل کردہ کتابوں اور مذہب کی معزز اور برگزیدہ شخصیتوں کا پورا احترام ہونا چاہیے۔ ان کی شان میں بدتہذیبی اور گستاخی ایک قابلِ تعزیر جرم ہے، جس کے ارتکاب پر اسلامی ریاست قانونی کارروائی کرے گی۔

غرفہ بن حارثؓ صحابی رسول ہیں۔ مصر کے ایک نصرانی کے پاس سے ان کا گزر ہوا جس کا نام مندقون بتایا جاتا ہے۔ انھوں نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ نبی ﷺ کی شان میں بدزبانی کرنے لگا۔ یہ بات عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (گورنر) تک پہنچائی گئی۔ اسے انھوں نے طلب کیا۔ غرفہؓ سے بھی کہا۔ ہمارا ان سے عہد و پیمان ہے، ہمیں اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ اس پر غرفہؓ نے کہا۔ معاذ اللہ! معاہدہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ ہمیں اللہ اور رسول کے سلسلے میں اذیت پہنچائیں۔ ہم نے انھیں یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے کلیساؤں میں، جو چاہیں کریں، اس میں کوئی مداخلت نہ ہوگی۔ ان پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، ان کی حفاظت کے لیے وقت ضرورت جنگ بھی کی جائے گی اور انھیں اپنے احکام پر عمل کی اجازت دی ہوگی۔ ہاں اگر وہ ہمارے

پاس مقدمہ لائیں تو ہم اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ عمرو بن عاصؓ نے تائید کی اور کہا آپ نے درست فرمایا۔

علماء کا اتفاق ہے کہ اسلام یا کسی دوسرے آسمانی مذہب اور اللہ کے رسول کی توہین مسلم یا غیر مسلم کوئی بھی کرے اس کے خلاف اقدام کیا جائے گا۔ بیشتر فقہاء اس کے لیے قتل کی سزا تجویز کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک پیغمبر کے سب و شتم پر قتل کی سزا نہیں ہے، البتہ کوئی شخص بار بار یہ حرکت کرے تو تعزیر کے طور پر اسے قتل کیا جاسکتا ہے۔^۲

یہ سزائیں بہ ظاہر سخت معلوم ہوتی ہیں لیکن مذاہب کا احترام اور وقار باقی رکھنے کے لیے ضروری ہیں ورنہ اندیشہ ہے کہ مذہب مذاق کا موضوع بن کر نہ رہ جائے۔ مشرکین عرب رسالت کے قائل نہیں تھے۔ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی۔ انھوں نے توحید کی جگہ شرک اور بت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت کی ہے کہ اس حساس اور نازک موضوع پر ان سے گفتگو اس ڈھنگ سے ہو کہ ان کے مذہبی جذبات مشتعل نہ ہوں، ورنہ اس کا رد عمل ہوگا اور بات اس حد تک بڑھے گی کہ خدا کی شان ہی میں گستاخی ہونے لگے گی۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيْنًا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلُهُمْ مُرْتَمٍ إِلَى رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ

تم لوگ برا بھلا نہ کہو ان معبودوں کو جنہیں یہ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں کہ وہ دشمنی میں بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر قوم کو ان کے عمل آراستہ کر دیے ہیں۔ پھر انہیں ان کے رب

۱۔ قال الہیثمی: رواہ الطبرانی (فی الاوسط) فیہ عبد اللہ بن صالح کتب اللیث قال عبد الملک بن سعید بن اللیث، ثقة مامون وضعفه جماعة و بقية رجاله ثقات، مجمع الزوائد و منبع الفوائد: ۶۳۶/۵۔ نیز ملاحظہ ہو: ۳۹۸/۶

۲۔ علامہ ابن قیمؒ نے فقہاء کے خیالات سے قرآن و حدیث کی روشنی میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو: احکام اہل الذمہ: ج ۳ ص ۱۳۵ تا ۱۳۵۷

مذہب کی آزادی کا حق

فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

کی طرف لوٹنا ہے۔ پس وہ انھیں بتا دے گا

(الانعام: ۱۰۸)

کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

اس سے یہ استدلال غلط نہ ہوگا کہ وہ مذاہب جو آسمانی مذاہب ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے یا جن کے آسمانی مذاہب ہونے کا قطعی ثبوت نہیں ہے ان کی محترم شخصیات یا ان کے معبودوں کی توہین کرنا اور ان کا مذاق اڑانا قابل تعزیر جرم قرار دیا جاسکتا ہے۔

کتا پات

کتابیات

کتاب میں جہاں قرآن مجید کی آیات آئی ہیں، ان کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ جن کتب مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، حواشی میں ان کے نام، جو کتاب ایک سے زیادہ جلدوں میں ہے اس کی جلد اور صفحات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے کتاب اور مصنف کا پورا نام، سن وفات اور کتاب کے پیش نظر نسخے کے مطبع اور سن طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے۔ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں ان کے مطابق وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

تفسیر:

- ۱- احکام القرآن: ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی م ۳۷۰ھ دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۴۱۵ھ
- ۲- أنوار التنزیل و أسرار التاویل: القاضی ناصر الدین البیضاوی م ۶۸۵ھ دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۸۸ء

حدیث:

- ۳- الادب المفرد: ابو عبد اللہ محمد بن اسمعیل البخاری، المطبعة السلفية و مکتبہا القاہرۃ ۱۳۷۸ھ
- ۴- الترغیب و الترهیب: عبد العظیم بن عبد القوی المنذری م ۶۵۶ھ دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۶ء

- ۵- جامع ترمذی: ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی م ۲۷۹ھ
- ۶- ریاض الصالحین: محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن الشرف النووی م ۶۷۶ھ دارالثقافة العربیة، بیروت ۱۹۹۱ء
- ۷- سنن ابن ماجہ: ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن عبد اللہ بن ماجہ القزوینی م ۳۷۳ھ
- ۸- سنن ابو داؤد: ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی م ۲۷۹ھ
- ۹- سنن نسائی: ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی النسائی م ۳۰۳ھ
- ۱۰- شرح السنة: ابو محمد حسین بن مسعود فراء البغوی م ۵۱۶ھ
- ۱۱- صحیح بخاری (الجامع الصحیح): ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری م ۲۵۶ھ
- ۱۲- صحیح مسلم: ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری م ۲۶۱ھ
- ۱۳- مجمع الزوائد و منبع الفوائد: حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی م ۸۰۷ھ دارالفکر، بیروت لبنان ۱۹۹۲ء
- ۱۴- مسند احمد: احمد بن حنبل الشیبانی ۲۴۱ھ المطبعة المیمنية مصر ۱۳۱۳ھ
- ۱۵- مشکوٰۃ المصابیح: ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی م ۷۳۷ھ یا اس کے بعد
- ۱۶- مؤطا امام مالک: مالک بن انس بن مالک م ۱۷۹ھ

شرح حدیث:

- ۱۷- التیسیر بشرح الجامع الصغیر: محمد عبد الرؤف المناوی م ۱۰۳۱ھ دارالمطبعة العامرة، مصر ۱۲۸۲ھ
- ۱۸- شرح صحیح مسلم: محی الدین ابو زکریا یحییٰ النووی م ۶۷۶ھ دارالکتب العلمیة لبنان ۱۴۱۵ھ

۱۹- فتح الباری: شهاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر
م ۸۵۲ھ المطبعة الخيرية مصر ۱۳۲۹ھ

۲۰- نیل الاوطار شرح منتقى الاخبار: قاضی محمد بن علی بن محمد الشوکانی
م ۱۲۵۵ھ، ادارة الطباعة المنيرية، مصر ۱۳۲۲ھ

فقہ و فتاویٰ:

۲۱- احکام اهل الذمہ: شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن القيم الجوزیة
م ۷۵۱ھ مکتبة رمادی للنشر الدمام. العروبة ۱۹۹۷ء

۲۲- بداية المجتهد ونهاية المقتصد: القاضی ابو الوليد محمد بن احمد ابن
رشد القرطبی م ۵۹۵ھ بیروت ۱۹۹۶ء

۲۳- الدر المختار شرح تنویر الابصار: محمد علاء الدین الحصکفی
مع

۲۴- رد المحتار علی الدر المختار: محمد أمين ابن عابدين م ۱۸۳۶ء مطبعة
عثمانیه، مصر ۱۳۲۷ھ

۲۵- الشرح الصغير علی اقرب المسالك الی مذهب الامام مالک:

علامہ احمد بن محمد الدردیر م ۱۷۸۶ء،
دارالمعارف مصر ۱۳۹۲ھ

۲۶- فتح القدير: کمال الدین محمد بن عبد الواحد السیواسی
المعروف بابن الهمام الحنفی م ۶۸۱ھ. المطبعة
الکبری بولاق، مصر ۱۳۱۶ھ

۲۷- الکفاية علی الهداية: جلال الدین الخوارزمی م ۱۸۳۳ء کلکتہ ۱۹۳۳ء

۲۸- مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیة: جمع و ترتیب عبد
الرحمن بن محمد بن قاسم، دارالعربية لبنان ۱۳۹۸ھ

۲۹- المغنی علی مختصر ابی القاسم الخرقی: ابو محمد عبد الله بن احمد
بن قدامة المقدمی م ۶۲۰ھ، هجر، قاهرہ ۱۲۱۳ھ

۳۰- الهدایہ شرح البدایہ (مختصر القدوری) برهان الدین ابو الحسن علی
بن ابی بکر المرغینانی، مطبع مجتبائی. دهلی

سیرت و تاریخ:

۳۱- الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر القرطبی م ۴۶۳ھ، دارالکتب العلمیۃ لبنان ۱۹۹۵ء

۳۲- الاصابة فی تمییز الصحابة: شهاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی م ۸۵۲ھ دارالکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۵ء

۳۳- الکامل فی التاریخ: ابن الاثیر الجزری م ۶۲۰ھ، دارالکتب العلمیۃ بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء

کتاب میں مصنف کی حسب ذیل تالیفات اور مضامین کے حوالے دیے گئے ہیں

۳۴- اسلام میں خدمت خلق کا تصور سید جلال الدین عمری ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

۳۵- عورت - اسلامی معاشرے میں ” مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

۳۶- عورت اور اسلام ” مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

۳۷- غیر مسلموں سے تعلقات اور

ان کے حقوق ” ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ

۳۸- مسلمان عورت کے حقوق اور

ان پر اعتراضات کا جائزہ ” مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

۳۹- وحدت بنی آدم اور اسلام ” مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

۴۰- Dr. S. Subramanian-Human Rights: International Challenges, Two volumes Manas Publications, New Delhi 1997

